امیر خسرو

اور

علی گڑھ

محی الدین اظہر

لکچرر شعبۂ فارسی،

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ



طبعِ اوّل ۱۹۸۱ء
تعداد .... ایک ہزار
مطبع .... نشاط برقی پریس۔ عید گاہ روڈ۔ ٹانڈہ فیض آباد
کتابت .... سید نبی احمد سیوانی

نسرین پبلشنگ ہاؤس
انوار مارکیٹ
جمال پور۔ علی گڑھ (یو۔پی)

انتساب

والدِ مرحوم
سیّد عبدالجبّار
کے نام

تقسیم کار

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،

۱۔ ——— جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

۲۔ ——— اُردو بازار، دلّی ۱۱۰۰۰۶

۳۔ ——— پرنس بلڈنگ، بمبئی ۴۰۰۰۰۳

۴۔ ——— مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

۵۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس

ایم۔ یو۔ مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

قیمت ——— ۳۰ روپے

مدینۃ العلم

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کی

بارگاہ

میں

گر قبول افتد زہے عز و شرف

فہرست

وسط الحیوٰۃ

نصاب بدیع العجایب و نصاب مثلث

لآلی عمان

قران السعدین

(ب)

خزاین الفتوح

حضرت امیر خسرو آف دہلی

اعجاز خسروی

پیش لفظ

۱۹۷۵ عیسوی کی بات ہے کہ آزادئ ہند کے طویل اٹھائیس سال بے خبری میں گذر جانے کے بعد حکومت ہند کو وطن کی خاک سے پیدا ہوئی اس عظیم شخصیت کی سات سو سالہ تقریبات منانے کا خیال آیا تھا جس نے ہندوستان کی وسیع و بیکراں تاریخ میں سب سے پہلی مرتبہ مذہبی تعصبات، ذات پات، اونچ نیچ اور رنگ و نسل کے جملہ امتیازی خانوں کو مسترد کرکے اپنی شعری تخلیقات کے ذریعہ اس ملک کے باشندوں کو انسانی مساوات اور حب الوطنی کے جذبات سے روشناس کرایا تھا۔ سرزمین ہند میں نوزائیدہ اسلامی حکومت کے باعث تہذیبی شکست و ریخت اور تشکیل و تعمیر کا جو فطری عمل شروع ہوا تھا، اس کو مثبت رُخ دینے کیلئے قدرت نے امیر خسرو کو پیدا کیا تاکہ وہ فاتح و مفتوح قوموں کے دلوں میں اخلاقی رواداری اور اخوت و ہمدردی کے جذبات پیدا کرکے گنگا جمنی تہذیب کو پروان چڑھانے میں کلیدی رول ادا کریں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی خلاقانہ زبان سے وطن کی محبت و عظمت کے جو نغمے پھوٹے تھے ان کو صدیوں کے انقلابات

بھی فضاؤں میں تحلیل نہ کر سکے، بلکہ زمانے کی ہزارہا گردشوں کے باوجود ان کی اہمیت روز بروز بڑھتی رہی اور بالآخر قومیت کے نئے نظریے کے تحت آج وہ ہر ہندوستانی کے دل کی آواز اور حکومت کا سب سے بلند بانگ نعرہ بن گیے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب اتنی عظیم ہستی کا جشن منانے کا اہتمام سرکاری طور پر ہو تو بیرمہ کاری رنگ بھلا کیسے ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا رہ سکتے ہیں چنانچہ ملک بھر کی علمی و ادبی انجمنوں اور تعلیمی اداروں کی جانب سے تمام دو مستند خسرو شناسوں کو امیر خسرو کی شخصیت اور فن کے مختلف گوشوں کو اجاگر کرنے کی دعوتیں دی گئیں۔ جس کے نتیجے میں مقالہ خوانی اور مباحثوں سے سیمناروں اور کانفرنسوں کی رونق بڑھی اور بہت سے دقیع تر مقالات سے رسایل و جراید کی زینت میں اضافہ ہوا۔

اس خوشگوار موقع پر میں نے بھی سوچا کہ خسرو پر کچھ لکھوں لیکن اپنی علمی بے مایگی کے احساس نے فوراً ہی اس طرح ادبوچا کہ یہ خیال ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ میرے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ایسے کس موضوع کا انتخاب کروں جو اچھوتا ہو یا کم از کم اس میں اتنا نیاپن ضرور ہو کہ میرے جذبۂ انفرادیت پسندی کو ٹھیس نہ لگے۔ کچھ دنوں بعد اچانک یہ بات ذہن میں آئی کہ علی گڑھ کی سو سالہ تاریخ میں یہاں کے علما و فضلا نے امیر خسرو کی شخصیت کو نمایاں کرنے میں جو کارنامے انجام دیے ہیں، ان کا جایزہ لینا نہ صرف ایک اچھوتا موضوع ہوگا، بلکہ اس طرح اس عظیم تعلیمی ادارے کی علمی و ادبی خدمات بھی منظر عام پر آ جائیں گی۔ امیر خسرو پر لکھی گئی متعدد کتابوں اور مضامین کا مطالعہ کرتے وقت جب علی گڑھ سے

شایع ہوئی تصانیفِ خسرو پر نظر پڑی تو اس خیال کو مزید تقویت حاصل ہوئی اور اس کام کو آگے بڑھانے کا حوصلہ بھی پیدا ہوا۔

چونکہ باضابطہ علمی نوعیت کی یہ میری پہلی کوشش تھی اس لیے بہت سے دشوار مرحلوں سے گذرنا پڑا۔ اور بالآخر مہینوں کے انہماک کے بعد "علی گڑھ اور حضرت امیر خسرو دہلوی" کے عنوان سے جو مقالہ تیار ہوا، اس کو اکتوبر ۱۹۷۷ عیسوی میں ماہنامہ "منادی" دہلی کے "امیر خسرو نمبر" میں نمایاں جگہ ملی۔ یہ مقالہ لکھتے وقت اگرچہ خود مجھ پر اس کی اہمیت واضح نہیں تھی مگر اشاعت کے بعد متعدد اہل قلم حضرات کے جو خطوط مجھے ملے ان میں سے "ایک بڑا تحقیقی کارنامہ" قرار دیکر مجھ پر یہ راز منکشف کر دیا گیا کہ میں نے انجانے میں ایک اہم کام کیا ہے۔ اس سے میری اتنی ہمت بڑھی کہ مقالہ مذکور کو وسعت دیکر ایک کتاب لکھنے کی تیاری شروع کر دی۔ چنانچہ پیش نظر کتاب "امیر خسرو اور علی گڑھ" اسی کی توسیع یافتہ شکل ہے اور اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ میری اس پہلی کوشش کو ایک مختصر مقالے سے شروع ہو کر کتاب کی منزل تک پہنچنے میں پورے چھ سال کا عرصہ لگا ہے۔

یہ کتاب چھوٹے بڑے نو (۹) ابواب پر مشتمل ہے جن میں سے سات صرف امیر خسرو کے حالات زندگی کو محیط ہیں۔ ان میں اگرچہ آپ کو بظاہر کوئی نئی تحقیق نہیں ملے گی۔ لیکن میں نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ کلی طور پر دوسروں کا چبایا ہوا لقمہ بھی نہیں ہے۔ اس کتاب کا بنظر غائر مطالعہ کرتے سے حالاتِ خسرو میں بعض اوقات ایسے نکات واضح ہوں گے کہ آپ چونک چونک اٹھیں گے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں نے محض آپ کو

تحقیر زدہ کرنے کیلیے ان پر کوئی بہتان تراشا ہے یا ان کی ہجو لکھی ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ عام روایات سے ذرا سا انحراف کر کے ان کے حالات کا جایزہ خود انھیں کی شعری و نثری تصنیفات کی روشنی میں لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ جب امیر خسرو نے خود کبھی پیغمبروں کی سی معصومیت یا فرشتوں کی سی بے گناہی کا دعوا نہیں کیا تو ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ان کو فرشتہ ثابت کریں۔ میں اپنے محدود مطالعے کے باوجود بلا خوفِ تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ خواجہ نظام الدین اولیا کے دامنِ تربیت میں پناہ لینے سے قبل ان کے اندر وہ تمام خطائی و نسیانی صفات موجود تھیں؛ جو نسلِ آدم کو فرشتوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ ابتدائے جوانی سے ایکر سلطان علاء الدین خلجی کے عہد کے پہلے نصف تک ان کے دامن پر خوش رنگیوں کے ساتھ بد رنگیاں بھی اتنی نظر آتی ہیں کہ ان کی شخصیت دنیا کی آلایشوں سے یکسر پاک نہیں معلوم ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ بر بنائے تحقیق میں اس روایت کو قابلِ قبول نہیں سمجھتا کہ امیر سیف الدین محمود نے بچپن ہی میں ان کو خواجہ صاحب سے بیعت کرا دیا تھا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ امیر خسرو نے عہدِ علائی کے دوسرے نصف میں پہلی مرتبہ خواجہ صاحب کے دستِ باصفا پر بیعت کی تھی، اور اس کے بعد ہی ان کی زندگی میں وہ اہم موڑ آیا جس سے پیدا شدہ راہ پر چل کر ان کو ایک عظیم صوفی کی حیثیت سے شہرتِ دوام ملی۔ اس موضوع پر ایک مقالہ بعنوان "در مردہ بسر چشمۂ حیواں رسید ماہی" "جامع تعلیمات" علی گڑھ کے شمارہ اپریل ۱۹۸۰ء میں شایع ہو چکا ہے۔ اس کتاب میں امیر خسرو کے حالاتِ زندگی کا اجمالی جایزہ جس نئے زاویۂ نظر

سے لیا گیا ہے وہ شاید بہت کم لوگوں کو پسند آئے، مگر اس کے باوجود میں اپنی اس جسارت کے لیے معذرت پیش کرنا اس لیے ضروری نہیں سمجھتا کہ نظریاتی اختلاف سے پیدا شدہ نت نئے مسایل ہی سے علوم و فنون اور علم و ادب کا دایرہ وسیع ہوتا ہے اور مجھے امید ہے کہ یہ کتاب خسرو شناسوں کو سنجیدہ مطالعے کی طرف ضرور مایل کرے گی۔

آٹھویں باب میں امیر خسرو کی جملہ دستیاب تصانیف کا اجمالی تعارف پیش کر کے ان کی علمی و ادبی، سیاسی، مذہبی تہذیبی اور تاریخی حیثیت واہمیت واضح کی گئی ہے۔ نویں باب میں جو دراصل اس کتاب کی جان ہے، یہ بتایا گیا ہے کہ خسرو کی تصانیف، شخصیت اور فن پر علی گڑھ میں کس نوعیت کا اور کتنا کام ہوا ہے۔ یہ کتاب جس مقالے کی توسیع یافتہ شکل ہے اس میں صرف ۱۹۱۴ سے ۱۹۱۸ عیسوی تک کے کاموں کو پیش کیا گیا تھا جبکہ اس باب میں سرسید کے عہد سے لیکر ۱۹۷۵ عیسوی تک کی تحقیقات کا جایزہ لیا گیا ہے۔ علی گڑھ تحریک کی ابتدا اگرچہ باضابطہ طور سے ۲۴ رمئی ۱۸۷۵ عیسوی کو" مدرستہ العلوم" کی تاسیس سے ہوئی تھی، مگر چونکہ سرسید اس کے بانی تھے اور انھوں نے اپنی اس تحریک کو شروع کرنے سے بہت قبل "آثار الصنادید" میں امیر خسرو کے مقبرے کی تعمیر کی تاریخ لکھی تھی اس لیے اس باب کا آغاز انھیں کے نام سے کیا گیا ہے۔ اس طرح "خسرو شناسی" کے موضوع پر علی گڑھ کی صد سالہ خدمات کے تحقیقی جایزے پر مشتمل یہ کتاب اگرچہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے مکمل ہے، لیکن

میرے نزدیک یہ کام ابھی نا تمام ہے۔ اس لیے یہ ارادہ ہے کہ (انشاء اللہ) مستقبل میں اس کا دوسرا حصہ بھی پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

چونکہ اس کتاب کے متعلق میں نے کبھی کسی سے کوئی مدد نہیں لی اور اس میں موجود تمام نقائص صرف اور صرف میری ذاتی کوتاہیوں اور علمی بے مائگی کا نتیجہ ہیں۔ اس لیے مبصرین کی طرف سے ہونے والی ہر قسم کی تنقید و تنقیص کا کھلے دل سے استقبال کرتے ہوئے آیندہ ایڈیشن کے وقت جملہ صحت مند مشوروں کو ملحوظ رکھا جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ اپنا یا اپنی کتاب کا تعارف کسی مشہور صاحب قلم سے کرانے کی بجائے میں نے خود ہی ان چند سطروں کو لکھنے پر اس لیے اکتفا کیا ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ میری خامیوں کے ساتھ کسی بزرگ کا نام ملوث کیا جائے ———

اس میں اگر کوئی خوبی ہے تو وہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے فضل، رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رحمت، اولیائے کرام کی عنایت اور بچپن سے اب تک کے میرے تمام اساتذہ کے فیضان کرم کا نتیجہ ہے ——— اس میں میری ذاتی خوبی کچھ بھی نہیں۔

محی الدین اظہر

۵/اکتوبر/۱۹۸۱

محی الدین اظہر
شعبہ فارسی علی گڑھ

پہلا باب

امیر محمود کا خاندانی پس منظر

اور

حالات زندگی

تیرھویں صدی کا زمانہ، تاریخ اسلام کا بہت ہی تاریک باب ہے۔ یہی وہ صدی ہے، جسمیں دنیائے اسلام اور مسلمانوں کو منگولوں کے ہاتھوں سب سے زیادہ ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ چنگیز خاں کی بہیمانہ قیادت میں صحرائے گوبی کے وحشی قبائیلیوں نے اپنی تمام بکھری ہوئی قوتیں یکجا کرکے ایک ایسا طوفان برپا کر دیا تھا، جس نے دنیائے اسلام کے عظیم ترین تہذیبی و تمدنی، علمی و ادبی اور مذہبی مراکز جیسے بغداد، بلخ، بخارا، سمرقند اور ہرات وغیرہ جڑوں سے اکھڑ گئے تھے۔ منگولوں کا حملہ کوئی منظم حملہ نہیں تھا، بلکہ وہ بغیر سوچے سمجھے، جدھر چاہتے، چل دیتے، اور پھر وہاں ویرانے ہی ویرانے نظر آتے۔ وہ صرف انسانی خون ہی کے پیاسے نہ تھے، بلکہ اپنے وحشیانہ جذبہ کی تسکین کے لئے بازاروں، شہروں، عمارتوں، باغوں اور فصلوں کو بھی آگ لگاتے جاتے تھے۔

یہ خانہ بدوش گھڑ سوار "قراقرم" کی پہاڑیوں سے خوفناک غول بن کر نمودار ہوتے اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے وسط ایشیا پر طوفانِ بلاخیز کی طرح چھا جاتے اور جس خطۂ زمین سے گذر جاتے تھے، وہاں صدیوں سے بسی ہوئی مہذب انسانوں کی آبادیاں تباہی و بربادی کی ایک دردانگیز داستان میں منتقل ہو جاتی تھیں۔ چنگیز خان ایک قیامت خیز طاقت بن کر ابھرا اور اسلامی دنیا کو تہہ و بالا کرتا ہوا گذر گیا۔ اور جو کچھ اس کے ہاتھوں سے بچ گیا تھا، اسے اس کے وارثین نے ختم کر ڈالا۔

جب سیکڑوں سال کی بنی بنائی بفضلہ اسلامی حکومتیں تباہ ہو رہی تھیں۔ اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہو رہا تھا۔ شہاب الدین غوری نے ہندوستان پر حملہ کر کے فتح حاصل کی اور پہلی بار اس سرزمین پر اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالکر خود تو واپس چلا گیا، لیکن اپنے وفادار ترک غلام قطب الدین ایبک کو اپنے جانشین کی حیثیت سے دہلی چھوڑ گیا۔ قطب الدین ایبک نے اپنے آقا شہاب الدین غوری کے انتقال کے بعد ہندوستان میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر کے دہلی کو اپنی سلطنت کی راجدھانی بنایا، لیکن قطب الدین ایبک کے بعد اس کا ترک غلام شمس الدین التمش جب ہندوستان کا بادشاہ ہوا تو اس نے سلطنت کی بنیادیں مضبوط اور مستحکم بنانے کے لیے اپنی ساری زندگی وقف کر دی۔ التمش بڑا ہی دیندار، نیک طینت، جنگجو اور بہادر بادشاہ تھا اور اس کے دل میں مسلمانوں کی تباہی و بربادی کا غم موجیں مارتا تھا۔ دنیائے اسلام کی بربادی کی داستان سن سن کر وہ بے قابو ہو جاتا، لیکن سیاسی مصلحت اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ دوسرے مسلمان منگولوں کے ساتھ مگر وہ بھی منگولوں کی یورش کا مقابلہ کرے۔ اور یہ اچھا ہی ہوا، کیونکہ اس وقت دہلی ہی ایک ایسا شہر تھا، جہاں اس دامن کے سایے تلے مسلمان سانس لے رہے تھے، اس کے باوجود ہر آن منگولوں کے حملے کا خطرہ لاحق رہتا تھا التمش نے تباہ شدہ اسلامی سلطنتوں سے آنے والے پناہ گزینوں کے لیے دہلی کے دروازے کھول دیے تھے۔ بادشاہ نے سب سے اچھا برتاؤ کیا اور ان کی لیاقت اور مرتبے

کے لحاظ سے انھیں خاطر خواہ عہدے بھی دیے۔ مہاجروں اور پناہ گزینوں کے ساتھ التمش کی دریادلی اور نوازشش کی شہرت نے اسلامی دنیا کے تمام ملکوں سے عالموں، فاضلوں، شاعروں، ادیبوں، امیروں اور سرداروں کو دہلی میں لا جمع کیا، اور یہی وہ خصوصیت تھی، جس کی وجہ سے شہر دہلی ـــــــ "عروس البلاد" کہا جانے لگا تھا۔

امیر خسرو کے والد، امیر سیف الدین محمود بھی ایسے ہی ایک پناہ گزین کی حیثیت سے ہندوستان آئے تھے۔ وہ ترکی النسل تھے اور "لاچین" قبیلے کے سردار بھی، تذکرہ نگاروں میں سے بعض کا خیال ہے کہ امیر خسرو کے والد کا ہی نام "لاچین" تھا اور چونکہ وہ اپنے قبیلے کے سردار تھے، اس لیے انھیں کے نام پر قبیلے کا نام بھی لاچین پڑ گیا، لیکن زیادہ تر تذکرہ نویس قبیلے کی وجہ تسمیہ سے مطلق خاموش ہیں۔ یہ بات قابل قبول نہیں کہ امیر خسرو کے والد کا نام "لاچین" تھا، کیونکہ انھوں نے اپنے والد کا نام ہمیشہ "سیف الدین یا صرف سیف" لکھا ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ امیر سیف الدین محمود کے اجداد میں سے کسی کا نام "لاچین" تھا جو کبھی اپنے قبیلے کے سردار رہے ہوں گے اور انھیں کے نام پر قبیلہ کا نام پڑ گیا ہوگا۔

امیر سیف الدین محمود کے قبیلے "لاچین" کے وطن کے بارے میں بھی اختلافات ہیں، لیکن شبلی نعمانی اور وحید مرزا اس پر متفق ہیں کہ یہ قبیلہ "ماوراء النہر" کے ایک تاریخی شہر "کش" میں آباد تھا (۱) ـــــ شہر کش کو قبیلہ لاچین کا وطن اس لیے بھی تسلیم کیا جاتا ہے کہ اس علاقے کے ترک ایسے اعلیٰ دلیری اور جنگجوئی کی جو اعلیٰ صفات رکھتے تھے، وہ سب قبیلہ لاچین کے افراد میں موجود تھیں۔

ماوراء النہر کے ترکوں کی بہادری اور شجاعت کا ذکر کرتے ہوئے وحید مرزا نے الاصطخری کا مندرجہ ذیل اقتباس نقل کیا ہے:

---

(۱) امیر خسرو مولفہ وحید مرزا (ص ۲۳) شعر العجم دوسری جلد۔

"اسلامی قوموں میں ان ترکوں کی طرح گھوڑے لڑانے والی کوئی اور قوم نہیں ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ ماوراء النہر کے چاروں طرف کفار کی آبادی ہے۔ یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ ان ترکوں سے بڑھ کر کوئی جری قوم نہیں ہے۔ .... وہ کافر ترکوں کے خلاف اسلام کی پشت پناہ ہیں ...... بہادری کے ساتھ ساتھ اپنے بزرگوں کی اطاعت اور اپنے بڑوں اور برابر والوں کی خدمت کرنے میں بھی یہ لوگ سب سے بڑھ کر ہیں ... اسی لیے خلفا کو یہ ترغیب ہوتی تھی کہ اپنی فوجوں کے لیے ان ترکوں میں سے سپاہی لیں ...... اور اس طرح ماوراء النہر کے کسان ان کی فوجوں کے قائد، ان کے خدام اور ان کے پسندیدہ مصاحب بھی بن گئے تھے"(۱)

عباسی خلافت کے آغاز ہی کے زمانے سے ترک مسلمانوں کی شجاعت ودلیری کے جواہر نمایاں ہونے لگے، کیونکہ تمام تر سیاسی استحکام، شان وشوکت اور رعب ودبدبے کے باوجود عباسی خلفا کو سرکش عربوں اور ایرانیوں سے آئے دن واسطہ پڑتا رہتا، اس لیے خلافت کی طرف سے باضابطہ فوجی محکمہ قائم کیا گیا تھا، جس میں بڑی تعداد میں ترکوں کو داخل کیا جاتا، اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ اس زمانے میں عربوں اور ایرانیوں کے مقابلے میں بہت زیادہ سیدھے سادے محنتی، جفاکش، جنگجو، دلیر اور وفادار ہوتے تھے۔ ان ترک مسلمانوں نے بہت ہی تھوڑے عرصے میں انھیں اعلا صفات کی بنا پر دنیائے اسلام میں اپنی عظمت کا غلغلہ پیدا کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے عربوں کی بجائے خود ناموس اسلام کے زبردست محافظ بن گئے۔

جب چنگیز خاں کا فتنہ اٹھا تو اور مہاجروں کی طرح امیر سیف الدین محمود بھی سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں اپنے قبیلے کے ساتھ دہلی آ گئے۔ سلطان کو

---

(۱) امیر خسرو، مولفہ وحید مرزا (ص ۲۰)

ابھی تخت نشین ہوئے زیادہ دن نہیں گذرے تھے کہ ہر چہار طرف سے بغاوتوں کے طوفان نے سر اٹھانا شروع کیا اور اس کے سارے حریف ایک ایک کر کے سلطنت پر قبضہ جمانے کی جد و جہد کرنے لگے۔ التمش کے زبردست دشمنوں میں تاج الدین بلدوز، ناصر الدین قباچہ اور خلجیوں کے نام قابلِ ذکر ہیں، لیکن صرف انھیں چند حریفوں اور باغیوں سے واسطہ نہ تھا، بلکہ بغاوت اور سرکشی کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا۔ جو کبھی ختم ہونے کا نام نہیں لیتا، اور ان بغاوتوں کو کچلنے اور جنگی مہموں کو سر کرنے کے لیے جانباز اور وفادار سپاہیوں کی ضرورت تھی۔ امیر سیف الدین محمود کا تعلق ماوراء النہر کے ترکوں سے تھا، جن کی وفاداری اور جانبازی کی دھاک عالم اسلام میں جمی ہوئی تھی، اور خود بادشاہ بھی ترکی النسل تھا، جس کی جوہر شناس نظر نے ان کی سپاہیانہ صلاحیتوں کو پہچان لیا، اور اس طرح انھوں نے اپنے قبیلہ لاچین کے افراد کے ساتھ بادشاہ کی فوج میں ملازمت اختیار کر لی اور "پٹیالی" میں سکونت پذیر ہو گیے۔

پٹیالی ــــ ضلع ایٹہ ــــ (صوبہ اتر پردیش) دریائے گنگا کے کنارے واقع ایک چھوٹے سے قصبے کا نام ہے، جس کا پرانا نام "مومن آباد" موسوم بھی ہے یہ مقام اس وقت ضلع کا صدر تھا اور یہاں فوجی چھاؤنی بھی تھی اور کسی زمانے میں دریائے گنگا اسی کے نیچے بہتا تھا، لیکن اب گنگا اور پٹیالی کے درمیان میلوں کا فاصلہ ہے (۱)

امیر سیف الدین محمود کے پٹیالی میں سکونت اختیار کرنے کا سبب کیا تھا، اس بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ امیر خسرو کے ایک معاصر اور مشہور مورخ ضیاء الدین برنی نے صرف اتنا لکھا ہے کہ انھیں بارہ سو تنکے سالانہ وظیفہ کے طور پر ملتا تھا (۲) ــــ لیکن اندازے سے کہا جا سکتا ہے کہ بہت ممکن ہے کہ یہ

---

(۱) حاشیہ شعر العجم دوسری جلد (ص ۱۰۸) (۲) امیر خسرو مولفہ وحید مرزا (ص ۲۰)

قصبہ ان کی جاگیر میں شامل رہا ہو، جس کی وجہ سے انھوں نے یہاں سکونت اختیار کرلی ہو، کیونکہ ہر امیر اور سردار کو جاگیریں ملا کرتی تھیں۔ امیر خسرو کے خود اپنے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے والد امیر سیف الدین محمود، التمش کی فوج میں کسی معزز عہدے پر فایز تھے۔ اور ان کا شمار سلطنت کے امرا میں ہوتا تھا، اور انھوں نے بادشاہ کی بغاوتوں کو کچلنے اور سلطنت کو مستحکم اور وسیع بنانے میں بھرپور مدد دی تھی اس رائے کے ثبوت کے سلسلے میں امیر خسرو کا یہ شعر قابل ذکر ہے:

جہان بقوتِ او می گرفت التمش
کہ برکشیدہ خلایش ز قبضۂ قدرت

امیر سیف الدین محمود کی زندگی کے بہت کم حالات معلوم ہیں، لیکن یہ بات مسلّم ہے کہ انھوں نے ہندوستان میں ہی شادی کی تھی۔ اگرچہ والہ داغستانی نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ:

'امیر خسرو اپنے باپ کے ساتھ "غزنین" کے راستے ہندوستان آیے تھے'
پھر آگے چل کر یہ بھی لکھا ہے کہ بعض کہتے ہیں کہ امیر خسرو کی ماں ہندوستان میں حاملہ آئی تھیں (۱)

والہ داغستانی کی ان دونوں روایتوں میں سے کسی ایک روایت کو بھی اگر صحیح مان لیا جائے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امیر خسرو ہندوستان میں پیدا نہیں ہوئے، اور اگر ہندوستان میں پیدا ہوئے بھی تو نہ ان میں ہندی نسل کی آمیزش تھی اور نہ ہی ان کے باپ امیر محمود کی شادی ہندوستان میں ہوئی تھی، لیکن امیر خسرو نے اپنے ہندوستانی ہونے پر فخر کرتے ہوئے کہا ہے کہ ــــــ "ہست مرا مولد و ماویٰ و وطن" اور شبلی نعمانی اور وحید مرزا، دونوں نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ امیر سیف الدین محمود نے ہندوستان ہی میں ایک ہندی نسل کی نیک سیرت خاتون سے شادی کی تھی، جو سلطان غیاث الدین

---

(۱) حاشیہ شعرالعجم دوسری جلد (ص ۱۰۸)

بلبن کے مشہور وزیر جنگ نواب عماد الملک کی صاحبزادی تھیں، اور انھیں خاتون کے بطن سے امیر محمود کے تین بیٹے پیدا ہوئے۔ جن کے نام حسبِ پیدائش اور عمر کے لحاظ سے حسبِ ذیل ہیں :

(۱) اعز الدین علی شاہ (۱)

(۲) امیر خسرو

(۳) حسام الدین قتلغ۔

امیر سیف الدین محمود کا آبائی پیشہ سپاہ گری تھا، اور وہ خود بھی سپاہی تھے اور سپاہیانہ زندگی گذارتے تھے، اور اسی مجاہدانہ شان کے ساتھ ایک جنگی مہم میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہید ہو گیے۔ امیر محمود کے انتقال کا مفصل حال نہیں معلوم ہو سکا ہے، کیونکہ اس سلسلے میں امیر خسرو کے تمام سوانح نگاروں نے خاموشی اختیار کی ہے۔ مگر چونکہ وہ ایک سپاہی تھے، اور وہ بھی بہت ہی جنگجو اور دلیر سپاہی، اور انھوں نے فرمانروائے ہندوستان سلطان شمس الدین التمش کے ساتھ باغیوں کی سرکوبی اور ہندوستان کی تسخیر میں بہت ہی اہم رول بھی ادا کیا تھا، اس لیے غالب امکان اس بات کا ہے کہ وہ میدانِ جنگ میں دشمنوں کا مقابلہ کرتے ہوئے مارے گیے ہوں گے، اور یہ رائے امیر خسرو کے اپنے اس بیان کی بنیاد پر قایم کی جا سکتی ہے جسے وحید مرزا نے نقل کیا ہے :

"شہادت کے تلخ گھونٹ کو پینے کے لیے انھوں (امیر محمود) نے اپنی جانِ شیریں دے دی اور اس حیاتِ جاوداں کا جام نوش کر لیا جس کا وعدہ قرآن مجید کی آیت ——— "بل هم احیاء عند ربهم" ——— (نہیں بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے رب کے پاس موجود ہیں) ——— میں کیا گیا ہے (۲)۔

---

(۱) شبلی نے شعر العجم کی دوسری جلد (ص ۱۰۸) اعز الدین شاہ لکھا ہے، جبکہ وحید مرزا نے "امیر خسرو" (ص ۲۷) میں اعز الدین علی شاہ تحریر کیا ہے، اور امیر محمود کے تینوں بیٹوں کی عمر کی ترتیب دی بتائی ہے جس کی رو سے "امیر خسرو اعز الدین علی شاہ سے چھوٹے اور حسام الدین قتلغ سے بڑے تھے۔ (۲) امیر خسرو مولفہ وحید مرزا (ص ۳۸)

جب امیر خسرو بہت کمعمر تھے، تبھی ان کے والد کا انتقال ہو گیا، لیکن اس کے باوجود باپ نے ان کی تعلیم و تربیت کا بچپن ہی سے خیال رکھا تھا اور جتنی زیادہ شفقت و محبت انھیں دی تھی، اس کی یاد زندگی کے کسی لمحہ میں بھی ان کے دل سے جدا نہ ہو سکی۔ وہ ہمیشہ اپنے باپ کے انتقال اور اپنی یتیمی کا ذکر بہت رنج و غم سے بھرپور انداز میں کیا کرتے تھے، چنانچہ انھوں نے اپنی علمی استعداد شاعرانہ صلاحیتوں کے فروغ اور شہرت و ناموری کا بنیادی سبب باپ کی شفقت آمیز تربیت کو بتاتے ہوئے "دیباچہ غرۃ الکمال" میں احسان مندی و تشکر کے بڑے گہرے جذبات کے ساتھ امیر محمود کا ذکر یوں کیا ہے:

"میری مٹی میں انھیں کا بویا ہوا بیج ہے جو اب کھل پھول رہا ہے۔"

امیر خسرو نے امیر محمود کی سادہ لوحی، نرم دلی، عادت و خصلت، دینداری اور ان کے دنیاوی معاملات کا بیان کرتے ہوئے "دیباچہ غرۃ الکمال" میں آگے چل کر لکھا ہے:

"ترک خواب ہی میں فرشتہ ہو سکتا ہے، لیکن وہ (امیر محمود) عالم بیداری میں بھی فرشتہ تھے۔ عام طور سے کبھی کسی نے فرشتہ کو تانے ہوئے نہ دیکھا ہوگا، مگر ان کی طبیعت میں فرشتہ خصلتی ایسی راسخ تھی کہ انھوں نے کبھی کسی سیہ چشم حور کے لیے بھی اپنی آنکھیں سرخ نہ کی تھیں، وہ دنیوی حیثیت سے امیر تھے اور دینی حیثیت سے صاحب ولایت۔"

امیر خسرو نے اپنے باپ امیر محمود کی تعلیم کے متعلق لکھا ہے کہ وہ "امی" تھے، ان کے اس بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امیر محمود پڑھے لکھے نہ رہے ہوں گے، اور اگر پڑھے لکھے رہے بھی ہوں گے، تو ان کی علمی استعداد اتنی زیادہ نہ رہی ہوگی کہ وہ علم و ادب کے میدان میں کوئی کارنامہ انجام دے سکتے، لیکن اتنی بات مسلّم ہے کہ وہ سیدھے سادے مجاہد مسلمان تھے، اور اپنے زائیف، اپنے معاملات اور اپنی نیت میں پاک عمل، پاک بیں، پاک دامن، پاک باز اور پاک دل تھے۔

دوسرا باب

امیر خسرو کی پیدائش اور تعلیم و تربیت

ابوالحسن یمین الدولہ خسرو کی پیدائش کے متعلق، والہ داغستانی کے علاوہ تمام تذکرہ نگاروں اور محققین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ وہ "پٹیالی" میں ۶۵۱ ہجری میں پیدا ہوئے (۱) لیکن وحید مرزا نے سنِ عیسوی کے لحاظ سے ان کا سالِ پیدائش ۱۰۹۳ عیسوی بتایا ہے (۲) جبکہ پروفیسر براؤن نے ۱۲۵۳ عیسوی لکھا ہے (۳) ممکن ہے وحید مرزا سے سنِ ہجری کی بنیاد پر سنِ عیسوی نکالنے میں چوک ہو گئی ہو، کیونکہ انھوں نے بھی سنِ ہجری کے اعتبار سے ۶۵۱ ہجری ہی لکھا ہے

جب امیر خسرو نے ذرا ہوش سنبھالا تو ان کے والد امیر سیف الدین محمود نے انھیں ایک مکتب میں پڑھنے کے لیے بٹھا دیا۔ امیر محمود

---

(۱) امیر خسرو مولفہ وحید مرزا (ص ۲۶)، لٹریری ہسٹری آف پرشیا تیسری جلد۔ مولفہ براؤن (ص ۱۰۹)
تاریخ ادبیات ایران مولفہ ڈاکٹر رضا زادہ شفق (ص ۱۱۳)

(۲) امیر خسرو مولفہ وحید مرزا

(۳) لٹریری ہسٹری آف پرشیا تیسری جلد، مولفہ براؤن (ص ۱۰۹)

ایک سپاہی پیشہ آدمی تھے۔ اور بغاوتوں کی سرکوبی اور جنگی مہموں کو سر کرنے میں مصروف رہا کرتے تھے، اس کے باوجود یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ انھوں نے اپنے ذہین اور ہونہار بیٹے کی تعلیم و تربیت کا بہترین انتظام کیا ہوگا۔ اور اس کام کے لیے منتخب روزگار اساتذہ بھی مقرر کیے ہوں گے، کیونکہ دہلی کے شاہی دربار سے ان کا تعلق تھا جہاں بڑے بڑے علما و فضلا کی آمد و رفت تھی اور خود امیر خسرو نے بھی اپنی تعلیم کی طرف باپ کی غیر معمولی توجہ کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

"میری مٹی میں اخیں کا بویا ہوا بیج بے جواب پھل پھول رہا ہے۔"

چونکہ اس زمانے کے اساتذہ خوش نویسی پر زیادہ توجہ اور زور دیا کرتے تھے اور بچوں سے اس کی خوب مشق بھی کرواتے تھے، اس لیے امیر خسرو کو بھی خوشنویسی کی مشق کرنی پڑی، مگر ان کی لطیف اور شاعرانہ طبیعت پر یہ کام گراں گذرتا تھا۔ اور پڑھنے لکھنے کے بجائے شعر موزوں کرنے میں اپنا زیادہ وقت صرف کیا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے پہلے دیوان "تحفۃ الصغر" کے دیباچے میں اپنے بچپن کا ایک واقعہ لکھا ہے، جسے ان کے تمام سوانح نگاروں نے نقل کیا ہے، اسی لیے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی وہ واقعہ مختصر میں بیان کیا جائے، کیونکہ اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پیدائشی شاعر تھے۔

قاضی اسدالدین یا مولانا سعدالدین (۱) اپنے زمانے کے مشہور خطاط تھے جن سے امیر خسرو خوشنویسی سیکھا کرتے تھے۔ ان کی قاضی عزالدین یا خواجہ عزیزالدین (۲) سے بہت اچھی دوستی تھی اور ان دونوں کا خواجہ اصیل کے گھر آنا جانا تھا۔ ایک روز قاضی اسدالدین امیر خسرو کو اپنے ساتھ لیے ہوئے خواجہ اصیل کے گھر گئے، جہاں پہلے ہی سے قاضی عزالدین موجود تھے اور شعر و سخن کی محفل جمی ہوئی تھی۔ چونکہ قاضی عزالدین شاعر

---

(۱) (۲) امیر خسرو مولفہ وحید مرزا میں "قاضی اسدالدین" اور "قاضی عزالدین" لکھا ہوا ہے (ص ۲۸) اور شعر العجم دوسری جلد مطبوعہ شبلی میں "مولانا سعدالدین خطاط" اور "خواجہ عزیزالدین" لکھا ہوا ہے (ص ۱۵۷۔۱۵۸۔۱۰۹)

بھی تھے شاید اسی وجہ سے قاضی اسدالدین نے امیر خسرو کی طرف اشارہ کرکے ان سے کہا:

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ لڑکا بھی ہے کچھ عوں غاں کرتا ہے، معلوم نہیں کہ موزوں بھی کہتا ہے یا نہیں؟ آپ ذرا اس کے کلام کو سن لیجئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (۱)"

قاضی عزالدین نے پہلے تو ایک بیاض سے کچھ اشعار پڑھوا کر سنے اور امیر خسرو کی خوش الحانی سے بے حد متاثر ہوئے، اس کے بعد قاضی اسدالدین کے مزید اصرار پر شعرگوئی کے امتحان کے واسطے چار بے جوڑ چیزوں کے نام لیے کہ ان کو ملا کر شعر موزوں کریں، امیر خسرو نے ــ "مو، بیضہ، تیر، خربزہ" ــ کو ملا کر برجستہ یہ رباعی کہی:

ہر موری کہ در دو زلف آن صنم است

صد بیضۂ عنبریں بران موی ضم است

چون تیر مدان راست دلش را زیرا

چون خربزہ دندانش میان شکم است (۲)

یہ رباعی سن کر قاضی عزالدین کو امیر خسرو کی شاعرانہ استعداد اور قوت تخیل پر بے پناہ مسرت ہوئی کہ انھوں نے چار بے جوڑ چیزوں کو ملا کر برجستہ اتنی عمدہ رباعی موزوں کردی شبلی نعمانی نے مذکورہ بالا واقعہ بیان کرنے سے پہلے لکھا ہے:

---

(۱) شعر العجم، دوسری جلد مولفہ شبلی نعمانی (ص ۱۰۹)

(۲) امیر خسرو مولفہ وحید مرزا میں یہ رباعی اس طرح لکھی ہوئی ہے، جیسے کہ نقل کی گئی ہے (ص ۲۹

ہر موے کہ در دو زلف آں صنم است — صد بیضۂ عنبریں براں موے ضم است

چوں تیر مداں راس دلش را زیرا کہ — چوں خربوزہ دندانش درون شکم است

شبلی نعمانی نے اس رباعی کے حاشیے میں لکھا ہے:

"جس نسخے سے یہ رباعی نقل کی ہے، وہ غلط تھا، میں نے اسی طرح نقل کر دیا۔"

". . . . . جب انھوں (امیر خسرو) نے ہوش سنبھالا تو ان کے والد نے اُن کو مکتب میں بٹھایا اور خوشنویسی کی مشق کے لئے مولانا سعد الدین خطاط کو مقرر کیا، لیکن امیر کو پڑھنے لکھنے کے بجائے شعر گوئی کی دھن رہتی تھی . . . . . (۱)"

شبلی نعمانی کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر محمود نے امیر خسرو کو "پٹیالی" کے ہی کسی مکتب میں پڑھنے کو بٹھایا تھا، اور مولانا سعد الدین یا قاضی اسد الدین، جو امیر خسرو کو خوشنویسی سکھانے کے لیے مقرر کیے گیے تھے، وہ اور ان کے دونوں دوست قاضی عزالدین، اور خواجہ اصیل (۲)، بھی وہیں کے رہنے والے تھے، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ امیر خسرو کی شاعرانہ استعداد اور بدیہہ گوئی کے امتحان کا واقعہ آٹھ سال کی عمر سے قبل "پٹیالی" ہی میں ان کے والد کی زندگی میں پیش آیا تھا، کیونکہ امیر محمود کے انتقال کے وقت ان کی عمر آٹھ سال تھی (۳) اور اس کے بعد وہ اپنے نانا عماد الملک کے ساتھ دہلی چلے گیے تھے۔ لیکن وحید مرزا نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

". . . . . . . اس وقت ان کی عمر دس سال سے زیادہ تھی . . . . (۴)"

اگر وحید مرزا کا یہ بیان درست مان لیا جایے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جب خواجہ اصیل کے گھر قاضی اسد الدین کے کہنے پر قاضی عزالدین نے امیر خسرو کی شعر گوئی کا امتحان لیا تھا، اس وقت ان کی عمر دس سال سے کم اور آٹھ سال سے زیادہ تھی، اور یہ واقعہ امیر محمود کے انتقال کے بعد ان کے نانا عماد الملک کی زندگی ہی" دہلی" میں ہوا تھا، اور مذکورہ تینوں افراد بھی دہلی ہی کے رہنے والے تھے، مگر یہ خیال قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا ہے کیونکہ امیر محمود

(۱) شعر العجم: دوسری جلد مولفہ شبلی نعمانی (ص ۹۰ - ۱۰۸) (۲) شعر العجم دوسری جلد میں شبلی نے لکھا ہے: خواجہ اصیل جو نایب کوتوال تھے مولانا سعد الدین سے خط لکھوایا کرتے تھے۔" (۳) شبلی نعمانی نے شعر العجم کی دوسری جلد میں لکھا ہے: سیف الدین محمود کے انتقال کے وقت امیر خسرو کی عمر سات برس تھی (ص ۱۰۸) لیکن وحید مرزا نے امیر خسرو میں لکھا ہے۔ "خسرو کے والد امیر محمود اس دنیا کو خیرباد کہہ گیے تھے۔ اس وقت امیر خسرو کی عمر ان کے اپنے بیان کے مطابق صرف آٹھ سال تھی" (ص ۲۰) (۴) امیر خسرو مولفہ وحید مرزا (ص ۲۵)

نے اپنے بیٹے امیر خسرو کو "پٹیالی" ہی کے کسی مکتب میں پڑھنے کو بٹھایا تھا اور اسی جگہ خوشنویسی کی مشق کرانے کے لیے قاضی اسدالدین کو مقرر بھی کیا تھا، یہ واقعہ پٹیالی کا ہو یا دہلی کا (۱)، لیکن اس واقعے اور مذکورہ بالا رباعی کی صحت کے متعلق کسی قسم کا شک اس وجہ سے نہیں پیدا ہو سکتا کہ ان دونوں ہی چیزوں کو امیر خسرو کے تمام سوانح نگاروں نے نقل کیا ہے، اور اس طرح یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ وہ بچپن ہی سے شعر کہنے لگے تھے۔ امیر خسرو نے اپنی شاعرانہ جولانی کا بیان کرتے ہوئے خود بھی دیباچہ تحفۃ الصغر میں لکھا ہے:

> میرے والد مجھے مکتب بھیجا کرتے تھے لیکن میں ردیف اور قافیہ کے چکر میں رہتا تھا۔ میرے قابل استاد سعدالدین محمد خطاط جو عام طور پر قاضی کے لقب سے مشہور تھے، مجھے خوشنویسی سکھانے کی کوشش کیا کرتے تھے، لیکن میں مہ جبینوں کے خط کی تعریف میں شعر کہتا رہتا تھا، اور اپنے استاد کی پوری کوشش کے باوجود طرۂ یار کی طرح، دراز اور مسلسل تھی، میں زلف اور شوق سے باز نہ آتا تھا۔"

امیر خسرو کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مادر زاد شاعر تھے اور بہت کم عمری کے زمانہ سے ہی ان کی موزوں طبیعت اور بلند پرواز تخیل کے سمندر میں موجود شاعرانہ موجیں، دیگر علوم و فنون کے سارے بند توڑ کر باہر نکل جانے کو بیقرار اور بیتاب رہا کرتی تھیں، اور انھیں قدرت کی صناعیوں، دنیا کی نیرنگیوں اور حسن کی جلوہ سامانیوں کے دیکھنے، محسوس کرنے اور ان سے لطف اندوز ہونے میں، فقہ اور فلسفے کی خشک کتابوں کے مطالعے سے زیادہ دلچسپی رہتی تھی۔ انھوں نے اپنی ابتدائی عمر میں، مروجہ علوم

---

(۱) ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی نے اپنے مقالات کے مجموعے "حرب ادب" کے ایک مقالے "امیر خسرو اور حب وطن" میں لکھا ہے: "امیر سیف الدین محمود چار سال کے بعد خسرو کو پٹیالی سے دہلی لے گئے یہاں ان کی تعلیم و تربیت کا بہترین انتظام کیا" — اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خسرو کی شعر گوئی کے امتحان کا واقعہ دہلی میں پیش آیا تھا۔

وفنون کے سیکھنے کی طرف کچھ زیادہ توجہ نہیں کی تھی، بلکہ جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی، ویسے ویسے ضروریات اور حالات کے تقاضے کے مطابق وہ اپنا مطالعہ بھی وسیع کرتے گئے، اور دنیا اور زندگی کے مشاہدات و تجربات کے اضافہ کے ساتھ ساتھ ان کے خیالات ونظریات میں بھی پختگی آتی گئی، اگرچہ انھوں نے کسی درسگاہ میں باضابطہ تعلیم حاصل نہیں کی اور جو کچھ بھی سیکھا، وہ ارباب علم وفن کی صحبت ہی میں سیکھا، لیکن اس کے باوجود یہ مسلّم ہے کہ وہ اپنے زمانے کے مختلف علوم وفنون اور زبان وادب کے ماہر تھے، جس کی وجہ سے ان کو اپنے ہمنشینوں اور ہمچشموں کے سامنے کبھی احساس کمتری میں مبتلا نہ ہونا پڑا، اور وہ جہاں کہیں گئے، وہاں قدرومنزلت اور عزت کی نگاہ سے دیکھے گئے۔

امیر خسرو کے نانا عمادالملک، التتمش ہی کے زمانۂ حکومت میں ایک معزز عہدے پر رہے تھے، جب التتمش کے انتقال کے بعد شاہی امرا میں اقتدار پر قبضہ جما لینے کی جنگ شروع ہوئی اور ملک میں ہر جگہ فتنہ وفساد سر اٹھانے لگا، تو ان نازک حالات کے دور میں، انھوں نے "عارضِ ممالک (۱)" کی حیثیت سے سلطنت کو مستحکم بنانے اور ملک میں امن وامان قائم رکھنے کے لیے بڑی گراں قدر خدمات انجام دی تھیں اور التتمش کے بعد اور غیاث الدین بلبن کے پہلے تک صرف تیس سال کے عرصے میں دہلی کے تخت شاہی پر یکے بعد دیگرے پانچ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا تھا، مگر جس وقت امیر خسرو کو اپنے سایۂ عاطفت میں لیا، اس زمانہ میں التتمش کا ترک غلام غیاث الدین بلبن حکومت کررہا تھا اور اس کے عہد میں "عارض راوت" کے عہدے پر فائز تھے، اس عہدے کی جو ذمہ داریاں اس زمانہ میں تھیں، ان کے بارے میں وحید مرزا نے لکھا ہے:

"..... راوت گجراتی زبان میں سوار کو کہتے ہیں اور اسی مناسبت سے عارض راوت کے فرائض یہ تھے کہ وہ شاہی سواروں کی دیکھ بھال اور نگرانی کریں اور اس کا خیال

---

(۱) عارض ممالک، راوت عرض، اور عارض راوت ایک ہی عہدے کے نام ہیں

رکھیں کہ ہر ایک سوار کے پاس گھوڑا موجود رہے اور اچھی حالت میں ہو تاکہ لڑائی کے وقت کسی قسم کی دقت نہ ہو..... (۱)

عماد الملک اگرچہ بظاہر ایک ایسے عہدے پر تھے جس کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں معلوم ہوتی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ پس پردہ حکومت کے نظم و نسق کے معاملات میں بڑا دخل رکھتے تھے، خاص طور سے ہندو راجاؤں سے معاملات طے کرنے اور تعلقات کو خوشگوار بنانے میں ان کا بہت اہم رول رہتا تھا، اور سیاسی پالیسیاں بنانے میں ان کو ایسا ملکہ حاصل تھا کہ بڑے بڑے معاملات اور مسائل کو بڑی ہی خوش اسلوبی سے حل کر دیتے تھے۔ چنانچہ ان کی اسی ذہانت اور سیاسی سوجھ بوجھ کی طرف امیر خسرو نے اشارہ کیا ہے:

> "..... عجیب راوت عرض تھے کہ ہندوستان کے معاملات کو سرانجام دینے میں اپنی صایب رائی سے جب چاہتے تھے کسی رایے کو الٹ کر یار بنا لیتے تھے .... (۲)

عماد الملک جو بڑے ہی نباض اور انسانی نفسیات کے ماہر تھے، امیر خسرو کی ان فطری صلاحیتوں سے واقف ہو گئے جو بچپن ہی سے اپنے آثار دکھانے لگی تھیں، چنانچہ انھوں نے اپنے یتیم نواسے کو بڑے ہی لاڈ و پیار سے پالا اور ان کی تعلیم و تربیت کے لیے میلان کی مناسبت سے ایسے استادوں کا انتخاب کیا جو اپنے زمانے کے مشہور اور جید علما تھے۔ اس کے علاوہ خسرو کو بچپن ہی سے اپنے نانا کی وساطت سے امیرانہ اور شاہانہ ماحول ملا اور شاہی دربار سے وابستہ باکمال علما و فضلا کی صحبت نصیب ہوئی، اور انھیں سب عناصر نے ملکر ان کی فطری صلاحیتوں کو خوب خوب ابھارا، نکھارا اور جلا بخشا۔ امیر خسرو کی تعلیم و تربیت کی طرف عماد الملک کی غیر معمولی توجہ کا بیان کرتے ہوئے وحید مرزا نے لکھا ہے:

---

(۱) امیر خسرو۔ (ص ۳۰ - ۳۹)

(۲) امیر خسرو مولفہ وحید مرزا (ص ۴۰)

"... یہ زیادہ تر عماد الملک کی توجہ ہی کا نتیجہ تھا کہ خسرو کی تعلیم و تربیت جو ان کے والد کے بے وقت انتقال سے ممکن تھا کہ ناقص اور ادھوری رہ جاتی، برابر جاری رہی اور خسرو نے جوانی کی سرزمین میں قدم رکھنے تک ان تمام علوم و فنون میں جو ان کے زمانے میں رائج تھے، اتنی دسترس حاصل کر لی تھی کہ احباب و اقران میں انھیں کبھی اپنی جہالت کی وجہ سے شرمندگی کا موقع پیش نہیں آیا ...." (۱)

امیر خسرو بچپن ہی سے اپنے نانا کے ساتھ شاہی دربار اور امرا و شرفا کی محفلوں میں آتے جاتے تھے، اور جب وہ کچھ بڑے ہوئے اور ان کی شاعری اپنا رنگ دکھانے لگی، تو دہلی کی بے تکلف نشستوں اور پر تکلف مجلسوں میں بھی بڑے احترام سے بلائے جانے لگے تھے، جہاں اس عہد کے ارباب علم و فن اور بڑے بڑے باکمال شاعروں کی موجودگی میں، وہ اپنے فن اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا کھل کر اظہار کرتے اور ان سے خراج تحسین حاصل کیا کرتے، لیکن قدرت کو یہ منظور نہ تھا کہ وہ زیادہ دنوں تک بے فکری کے ساتھ شباب کی نیرنگیوں سے لطف اندوز ہوں اور اپنی طبیعت کی جولانیوں کا کرشمہ دکھائیں، گویا ابھی وہ ایک ہونہار شاعر کی حیثیت سے دہلی اور اس کے اطراف و جوانب میں متعارف ہی ہو رہے تھے کہ ۶۷۱ ہجری میں جب ان کی عمر صرف بیس سال کی تھی، اس وقت ایک سو سترہ سال کی عمر میں، ستر سال تک ملک و قوم کی مسلسل خدمت انجام دینے کے بعد، عماد الملک اس دنیا سے رحلت کر گیے، اور وہ ایک بار پھر اسی احساس تنہائی اور شورِ بیکسی میں گھر گیے، جس سے نکال کر نانا نے ان کے دامن میں زندگی کی ساری رعنائیاں اور زیبائیاں بھر دی تھیں۔

امیر خسرو کے حساس دل کو عماد الملک کے انتقال سے کیسا صدمہ پہونچا تھا اور ان پر کیا کیفیت گذری تھی، اس کا اندازہ اس مرثیے کو پڑھ کر ہوتا ہے، جو ان کے پہلے دیوان "تحفۃ الصغر" میں درج ہے اور جس کے چند اشعار کی تلخیص وحید مرزا نے اردو نثر میں پیش

(۱) امیر خسرو مولفہ وحید مرزا (ص ۲۴)

کی ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسے یہاں بھی نقل کیا جائے :

"وہ چراغ گل ہوگیا، شمع فلک بجھ گئی، دونوں جہانوں کی بنیاد تباہ ہوگئی، عارض حضور بادشاہ میں کیوں نہیں آتا؟ اے آصف بادشاہ خود تیرے لیے رو رہا ہے اور اے عارض دیوان بھی تیرا ماتم کر رہا ہے، قبۂ آسمان کا ستون منہدم ہوگیا ہے، یہی وجہ ہے کہ قصر شاہی کے بام و در تک سوگوار نظر آتے ہیں، ترکوں نے اپنے کلاہ اتار پھینکے ہیں اور اپنے چغے دامنوں تک چاک کر لیے ہیں، اور ہندو راجہ برہمنوں کی طرح سر ننگے کیے ہوئے پریشان اور غمزدہ آنسو بہا رہے ہیں ..... [1]"

اس مرثیے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عماد الملک نے امیر خسرو کو کس کس چاؤ چوچلے سے پالا پوسا تھا اور ان پر شفقت و محبت کے کیسے کیسے پھول نچھاور کیے تھے کہ نانا کے انتقال پر ان کو قبۂ آسمان کا ستون منہدم ہوتا ہوا اور شمع فلک بجھتی ہوئی اور دونوں جہانوں کی بنیاد تباہ ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

---

(۱) امیر خسرو مولفہ وحید مرزا (ص ۲۰)

تیسرا باب

بلبنی حکومت میں دہلی کی علمی فضا

شہاب الدین محمد غوری اور قطب الدین ایبک نے ہندوستان میں جس اسلامی سلطنت کی بنیاد ڈالی تھی، اسے بچائے رکھنے اور مزید سیاسی استحکام اور جغرافیائی وسعت بخشنے کے لیے سلطان شمس الدین التمش نے اپنی پوری زندگی وقف کر دی تھی اور آخری سانس تک مسلسل جدوجہد اور جاں فشانی سے دشمنوں اور باغیوں کی سرکوبی کرتا رہا۔ لیکن التمش کے انتقال کے فوراً ہی بعد اقتدار پرست اور خود غرض امرا نے اس چمن زار کو اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں تلے روند ڈالنے کی بھرپور کوشش کی جس کی آبیاری کے لیے اس نے اپنے دل و جگر کا آخری قطرۂ خون تک بہا دیا تھا۔ التمش کا انتقال ۶۳۳ ہجری میں ہوا تھا۔ اس وقت سے لیکر ۶۶۴ ہجری تک یعنی تیس سال کی مختصر مدت میں دہلی کے تخت پر یکے بعد دیگرے پانچ بادشاہ مسند نشین ہوئے اور ان پانچوں میں صرف آخری حکمران ناصر الدین نے

سب سے زیادہ عرصے یعنی بیس سال تک حکومت کی اور اسی کے بعد غیاث الدین بلبن دہلی کی سلطنت کا حکمراں ہوا۔

غیاث الدین بلبن کا خاندانی تعلق ترکوں کے "البری" قبیلے سے تھا اور اس کے اندر ترک قوم کی تمام اعلا صفات جیسے جنگجوئی، دلیری، بہادری، جفاکشی وفاداری اور جاں نثاری وغیرہ بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ التمش کی ملازمت میں داخل ہوتے ہی بلبن نے ایسے ایسے نمایاں و قابلِ قدر کارنامے انجام دیے کہ بادشاہ کی خاص توجہ کا مرکز بن گیا اور التمش نے خوش ہو کر اسے اپنے خاص چالیس غلاموں اور جاں نثاروں کے زمرے میں شامل کر لیا تھا۔ بلبن کی اس روایتی وفاداری اور جانبازی کی بنا پر رضیہ سلطانہ نے اسے اپنا میر شکار بنایا تھا اور ناصر الدین نے بھی سرحدی علاقوں کی دیکھ بھال اور مغلوں کے حملوں کی روک تھام کرنے کے واسطے مقرر کیا تھا اور یہ اس کے فکر و تدبر اور لامتناہی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان پر مغلوں کے سارے تابڑ توڑ حملے یکے بعد دیگرے ناکام ہوتے گیے، چنانچہ جب وہ بادشاہ ہو، تو سلطنت کے انتظامی امور کی طرف خاص طور سے توجہ دینے لگا تھا۔ بلبن بڑا ہی سخت گیر اور اصول پسند حکمراں تھا۔ جیسا کہ اس واقعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ ہونے سے پہلے وہ بہت کثرت سے شراب پیتا تھا، لیکن اپنی بادشاہت کا اعلان کرتے ہی اس نے سب سے پہلے خود شراب چھوڑی اور اس کے بعد شہزادوں، امیروں، رئیسوں اور عوام کی شراب نوشی پر پابندی عاید کی تھی۔

یہ اور بات ہے کہ امرا ورؤسا موقع پا کر چپکے سے پینے پلانے اور ناچ رنگ کی محفلیں منعقد کر کے دادِ عیش دے لیا کرتے تھے اور کبھی کبھار بہت چھپ چھپا کر شہزادے بھی ایسی محفلوں میں شریک ہو کر اپنا شوق پورا کر لیتے تھے۔ بلبن اور اس کے شہزادے اور امراے سلطنت علم و ہنر کی قدردانی اور اپنی سخاوت کے لیے دنیا بھر میں مشہور تھے۔ بلبن کے امرا بُرے اور غلط کاموں میں نہیں بلکہ ہمیشہ اچھے اور نیک کاموں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کیا کرتے اور اپنی دریا دلی کے باعث بیشتر امرا مقروض بھی رہا کرتے تھے۔ بلبنی عہدِ حکومت کا یہ طرۂ امتیاز تھا کہ اس دور

کے امرا مال و دولت، جاگیر اور اقتدار کے لیے ایک دوسرے سے ذرا بھی رقابت نہیں رکھتے تھے، بلکہ ان میں سخاوت، نیکی، عوامی فلاح و بہبود اور دیگر اعلا اوصاف کے معاملے میں باہمی رشک و رقابت پائی جاتی تھی، چنانچہ برنی نے اس زمانے کے امرا کی حالت یوں بیان کی ہے:

"........ بلبنی ملکوں میں آپس میں جاگیروں، مال و دولت کی فراوانی یا بڑے بڑے عہدوں کی وجہ سے کوئی رقابت یا مخاصمت نہ تھی، بلکہ جو بھی باہمی رشک و رقابت تھی وہ سخاوت اور دریا دلی کے کاموں میں تھی، چنانچہ اگر کوئی ملک یا خان سن لیتا تھا کہ کسی اور ملک یا خان کے دسترخوان پر پانچ سو آدمیوں کو مدعو کیا گیا تھا تو وہ اپنے دسترخوان پر ایک ہزار آدمیوں کو کھلاتا تھا۔ یا اگر کسی کو معلوم ہوتا تھا کہ فلاں ملک نے دو سو تنکے خیرات کیے تو وہ رشک کرتا تھا اور چار سو تنکے خیرات کر دیتا تھا اور اگر کسی امیر نے اپنی محفل شراب میں پچاس آدمیوں کو گھوڑے اور سو آدمیوں کو خلعت عطا کیے تو جب تک دوسرا اپنی محفل میں سو گھوڑے اور دو سو خلعت تقسیم نہ کر لیتا تھا اسے چین نہ آتا تھا۔ (۱)"

امیر خسرو اگرچہ سلطان ناصرالدین کے عہد میں پیدا ہوئے تھے مگر ان کے عنفوانِ شباب نے اس وقت اپنا رنگ دکھانا شروع کیا جب دہلی کے تخت پر غیاث الدین بلبن حکومت کر رہا تھا۔ اس کی حکمرانی کا زمانہ علم و ہنر کی قدردانی اور عالموں، شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں کے ابھرنے اور ترقی کے لیے بہت موافق اور سازگار تھا۔ چونکہ امیر خسرو کے نانا دہلی کے شاہی دربار سے وابستہ تھے۔ اس لیے ان کی وساطت سے خسرو کو بھی درباری امرا و رؤسا اور علما و فضلا سے تعلق ہو گیا تھا اور ان کے یہاں منعقد ہونے والی شعری و ادبی اور علمی مجلسوں میں وہ بڑے احترام سے

---

(۱) تاریخ فیروز شاہی مصنفہ برنی (ص ۱۲۰-۱۱۹)

بلائے جاتے تھے۔ دہلی کی علمی و ادبی فضا میں پروان چڑھ کر ان کی فطری صلاحیتیں خوب خوب ابھریں اور نکھریں اور جلا پائیں۔ خسرو نے بہت ہی کمسنی کے زمانے سے فارسی کے متقدمین شعرا کے کلام کا مطالعہ شروع کر دیا تھا اور خود بھی بچپن ہی سے شعر کہنے لگے تھے۔ انھوں نے بعض استادوں کی پیروی کرنی چاہی اور کوشش بھی کی لیکن زیادہ دنوں تک وہ کسی کی بھی پیروی نہ کر سکے اور اپنے اس فطری رنگ و آہنگ پر آگئے جو قدرت نے انھیں ودیعت کی تھی۔ انھوں نے شاعری کی تمام مروجہ اصناف میں نہ صرف طبع آزمائی کی بلکہ خوب خوب کہا اور اپنے مخصوص رنگ و آہنگ اور منفرد لب و لہجہ میں وہ نغمہ سرائی کی کہ ان سے پہلے کبھی کسی شاعر نے نہیں کی تھی، لیکن قدرت کو یہ منظور نہیں تھا کہ وہ زیادہ دنوں تک بے فکری کے ساتھ شباب کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہوں، چنانچہ ابھی وہ ایک ہونہار شاعر کی حیثیت سے دہلی میں متعارف ہی ہو رہے تھے کہ اچانک نانا کا انتقال ہو گیا۔ باپ کی وفات کے بعد نانا ہی کی بے پایاں شفقت و محبت کے سایے تلے وہ پلے بڑھے اور پروان چڑھ رہے تھے کہ اب جو نانا کا انتقال ہوا تو رہا سہا ایک آخری سہارا بھی جاتا رہا۔ جس کی وجہ سے وہ فکر معاش میں مبتلا ہو گئے اور انھیں ملازمت کی شدید ضرورت محسوس ہوئی، لیکن پریشانی کے یہ دن بھی زیادہ عرصے تک نہ رہ سکے کیونکہ حسن اتفاق سے انھیں ایک سرپرست مل گیا تھا۔

چوتھا باب

امرائے دہلی سے خسرو کے تعلقات

ملک چھجو

عماد الملک کا انتقال جب ۶۸۱ ہجری میں ایک سو سترہ سال کی عمر میں ہوا (۱)، تو اس وقت خسرو کی عمر تقریباً بیس سال کی تھی، اور اسی عمر میں انھوں نے اپنا پہلا دیوان "تحفۃ الصغر" مرتب کر کے اچھی خاصی شہرت بھی حاصل کر لی تھی۔ جس کی وجہ سے ان کے اندر ایک قسم کا فخر اور خودستائی کا جذبہ بھی پیدا ہو گیا تھا، جو عمر اور فن دونوں میں پختگی آنے کے ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ ختم ہوتا گیا۔ امرائے سلطنت سے ان کے مراسم پہلے ہی سے اچھے تھے اور سلطان غیاث الدین بلبن کی مدح میں بھی وہ متعدد قصاید کہہ چکے تھے اور دہلی کے تقریباً تمام امرا اس بات کے خواہش مند اور منتظر تھے کہ خسرو ان کی ملازمت میں داخل ہو جائیں، لیکن دہلی میں اس ہمہ گیر شہرت و مقبولیت کے باوجود انھوں نے شاہی دربار تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ شاید اس وجہ سے کہ بلبن جیسے لہو و لعب کے دشمن اور سخت گیر بادشاہ سے انھیں

(۱) امیر خسرو مولفہ وحید مرزا (ص ۴۵)

کچھ زیادہ قدردانی کی توقع نہ تھی، نتیجتاً انھوں نے پہلے مربی اور سرپرست کی حیثیت سے علاء الدین محمد کشلو خاں کو منتخب کیا۔ جو عرفِ عام میں ملک چھجو کہلاتا تھا (۱) اور بلبن کا اپنا بھتیجا اور "باربک" کے عہدے پر فائز تھا (۲)

امیر خسرو کی نگاہِ انتخاب ملک چھجو پر شاید اس وجہ سے پڑی کہ وہ بہت جنگجو اور بہادر اور انتظامِ حکومت میں ماہر ہونے کے ساتھ ہی شعر و سخن کا بھی دلدادہ تھا اور بقول برنی سخاوت میں حاتم طائی سے بھی بازی لے گیا تھا (۳) شبلی نعمانی اس کی سخاوت کا ذکر کرتے ہوئے فرشتہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"مجلس آرائی اور جود و کرم کی وجہ سے حاتم طائی کی طرح مشہور ہوگیا تھا اور مصر، شام، روم، بغداد، عراق، خراساں، ترکستان وغیرہ سے اہلِ کمال اور شعرا اس کے دربار میں آتے تھے اور کامیاب ہو کر جاتے تھے، بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ جو کچھ نقد اسباب و سامان تھا، سب لٹا دیا، یہاں تک کہ خود اس کے بدن پر پیرہن کے سوا کچھ نہ رہا (۴)"

ملک چھجو کی دلچسپیوں اور اس کے مذاق اور اس کی شہرت کا بیان پروفیسر وحید مرزا نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"..... شکار و چوگان بازی میں سرکردۂ روزگار تھا بلکہ کہا جاتا ہے کہ ان چیزوں میں اس کی شہرت ہندوستان سے خراسان تک پہنچ گئی تھی اور اس کی تعریفیں سن کر چنگیز خاں کے پوتے ہلاکو نے اسے اپنے

---

(۱) چھجو خاں کا نام تاریخوں میں اس طرح مختلف لقب اور خطاب سے آیا ہے، دھوکا ہوتا ہے کہ ایک شخص ہے یا کئی ہیں۔ امیر خسرو دیباچۂ غرۃ الکمال میں لکھتے ہیں کہ میں ناصری وفات کے بعد سب سے پہلے خانِ معظم کشلو خاں عرف ملک چھجو کے دربار میں پہنچا، اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہ اور چھجو ایک ہی شخص کے نام ہیں۔ حاشیہ شعر العجم دوسری جلد مولفۂ شبلی نعمانی (ص ۱۱) (۲) امیر خسرو مولفۂ وحید مرزا (ص ۵۲) (۳) امیر خسرو (ص ۵۳) (۴) شعر العجم دوسری جلد (ص ۱۱)

ملک میں ملا لینے کی بہت کوشش کی اور عراق کا آدھا ملک دے دینے کا لالچ بھی دلایا لیکن وہ نہ گیا، خود بلبن کو بھی اس کے رسوخ اور ہر دلعزیزی کی وجہ سے اس کی جانب سے کھٹکا لگا رہا کرتا تھا (۱)"

امیر خسرو کے مزاج میں بچپن ہی سے حسن پرستی، شوخی، ظرافت اور چھیڑ چھاڑ موجود تھی، جو نانا کے انتقال کے باعث کچھ دنوں کے لیے رخصت ہو گئی تھی، مگر ملک چھجو جیسے قدر دان، سخی اور دریا دل امیر کی ملازمت میں داخل ہوتے ہی، ان کے سارے تفکرات ختم ہو گئے اور فطری احساس لطیف پھر سے واپس آگیا۔ خسرو شاعر تھے اور جوان تھے اور ان کا مربی بھی شعر و سخن کا قدردان اور جی کھول کر داد عیش دینے والا تھا، وہ اس کے دربار میں حاضر رہتے اور حسن و عشق کے جذبات و احساسات سے بھرپور اشعار کے ذریعے شراب و نگار و شباب کی محفلیں گرم کیے رکھتے اور اس طرح دو سال تک اس کے دربار سے وابستہ رہ کر اپنے مدحیہ اشعار کے پھول اس پر لٹاتے رہے، چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں:

"دو سال تک میں نے اس کی مجلس میں ایسے ایسے قصیدے اس کی تعریف میں پڑھے کہ جیسے اور کی مدح میں نہیں کہہ سکتا تھا (۲)۔"

امیر خسرو نے ملک چھجو کی مدح میں ایک قصیدے کی تمہید لکھی ہے:

بود پنہاں آفتاب آں دم کہ صبح   چہرہ ی باباد عنبر بو نمود
صبح را گفتم کہ خورشید کجا است   آسماں روی ملک چھجو نمود (۳)

ملک چھجو کی ملازمت میں خسرو کو رہتے ہوئے دو سال کا عرصہ ہو رہا تھا کہ ایک بار بلبن کا دوسرا بیٹا شہزادہ بغرا خاں بھی اس کی مجلس عیش میں پہنچ گیا، اس کو وہاں خسرو کے اشعار اور ترنم اس قدر پسند آئے کہ اس نے ان پر انعام و اکرام کی بارش کر دی، لیکن یہ بات ملک چھجو کو ناگوار گذری کہ اس کے ہوتے ہوئے خسرو نے بغرا خاں کا

---

(۱) امیر خسرو (ص ۲۳) (۲) دیباچۂ غرۃ الکمال۔ (۳) شعر العجم دوسری جلد (ص ۱۱۱)

دیا ہوا انعام کیوں لیا، فوراً ہی اس کے چہرے سے حزن و ملال کے آثار نمایاں ہو گئے، حالانکہ خسرو نے اس کی جمع خاطر کے لیے تلافی کی بہت کوشش کی، لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے، چنانچہ خود لکھتے ہیں:

"مگر کشلو خاں میں حسد و رشک بہت تھا اور اس کے چہرے پر فوراً ناراضگی کے آثار ظاہر ہو گیے، میں نے اسے ہر طرح منانے کی کوشش کی مگر وہ میرا کوئی عذر نہ سنتا تھا۔ اس واقعے کو کئی دن گذر گیے لیکن گذشتہ باتوں کی یاد اس کے دل سے محو نہ ہوئی، وہ مجھے سزا دینا چاہتا تھا، اور اپنے غصّے کے تیر کا نشانہ بنانے کا ارادہ رکھتا تھا، اسی لیے میں بھی تیر کی طرح بھاگ نکلا (۱)۔"

---

(۱) دیباچہ غرۃ الکمال

بغرا خاں

جب امیر خسرو اپنے پہلے مربی ملک چھجو کی حد سے بڑھی ہوئی ناراضگی کے سبب اس سے مایوس ہو گیے، تو انھوں نے کسی اور امیر کی سرپرستی کے سایے تلے پناہ لینی چاہی، ایسی نازک اور کش مکش کی حالت میں انھیں بغرا خاں کا خیال آیا، کیونکہ وہ علم و ہنر کا سرپرست اور شعر و سخن کا قدر دان بھی تھا، اور ملک چھجو کے محل میں منعقد ہوئی مجلسِ عیش میں ان کے شاعرانہ کمال، علمی استعداد اور ترنم کی شیرینی سے بے حد متاثر بھی ہوا تھا، اور حقیقت یہ تھی کہ امیر خسرو سے ملک چھجو کے متنفر ہو جانے کا سبب بھی اسی کی عنایات تھیں۔ چنانچہ خسرو بھی بہت ساری امیدیں لیکر قسمت آزمائی کے لیے "سامانہ" چل پڑے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مغل فوجیں ہندوستان پر آیے دن حملہ آور ہوتی رہتی تھیں اور ان کے حملوں کو روکنے کے لیے ہندوستان کے سرحدی علاقوں میں زبردست دفاعی محاذ قایم کیے گیے تھے۔ ان فوجی بارکوں میں "ملتان اور سامانہ" کو بڑی اہمیت حاصل تھی، اور یہاں کی حکومت اسی شخص کے سپرد کی جاتی تھی جو فنونِ سپہ گیری کا ماہر، فکر و تدبر کا حامل اور انتظامی امور میں یکتا ہوتا تھا اور جسے بادشاہ اپنا معتمد اور وفادار بھی سمجھتا تھا، یہی وجہ تھی کہ سلطان غیاث الدین بلبن نے اپنے بڑے بیٹے شہزادہ محمد کو "ملتان" اور دوسرے بیٹے بغرا خاں کو "سامانہ" کی حکومت دی تھی۔ جب امیر خسرو سامانے پہنچے تو بغرا خاں ان کی غیر متوقع آمد پر بہت خوش ہوا اور ان کا پر جوش خیر مقدم کیا، اس نے ان کی ایسی قدر و منزلت کی کہ بہت جلد اپنے خاص ندیموں اور مصاحبوں کے حلقے میں شامل کر لیا، مگر عیش و آرام، سکون و اطمینان اور مسرتوں کے یہ دن ان کے ساتھ زیادہ عرصے تک نہ رہ سکے اور انھیں سامانہ چھوڑنا پڑا۔

غیاث الدین بلبن کے ملکوں میں "طغرل" نام کا ایک ملک تھا جسے "لکھنوتی" (۱)

(۱) صوبہ مغربی بنگال میں واقع شہر "مرشد آباد" کا قدیم تاریخی نام "لکھنوتی" ہے۔

اور "بنگال" کے صوبوں کی حکومت سونپی گئی تھی۔ وہ ان علاقوں میں اپنے ذاتی اثر و رسوخ کے ذریعے کافی دولت اور فوجی طاقت بڑھا کر خود سری پر آمادہ ہو گیا۔ اس نے بلبن کے خلاف بغاوت کر کے لکھنوتی اور بنگال میں اپنی حکومت قائم کر لی اور اپنے لیے "مغیث الدین" کا لقب اختیار کر کے اپنے نام کا سکہ اور خطبہ بھی جاری کر دیا۔ جب بلبن کو اس واقعے کی خبر ملی تو اس نے اپنے سپہ سالار "امین الدین" کی سرکردگی میں بغاوت کو کچلنے کے لیے شاہی لشکر روانہ کیا، مگر امین الدین نے شکست کھائی اور دہلی واپس آ گیا، اس کے بعد بادشاہ نے دوسرا لشکر روانہ کیا اور طغرل نے اسے بھی شکست دے دی۔ شاہی لشکر کی پے درپے دو شکستوں سے غیاث الدین بلبن سخت غم و غصے میں مبتلا ہو گیا اور اس نے خود ہی لکھنوتی کی جانب کوچ کرنے کا ارادہ کیا، اگرچہ تمام امرائے سلطنت اور مشیروں نے اسے اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی، مگر اس نے کسی کی بات نہ مانی اور اس مہم پر اپنے ساتھ جانے کے لیے بغرا خاں کو سامانے سے طلب کیا۔

امیر خسرو اگرچہ سفر سے بہت گھبراتے تھے اور بہت نازک مزاج بھی تھے، اس کے باوجود بغرا خاں کے دوسرے ندیموں اور مصاحبوں کی طرح وہ بھی بادلِ ناخواستہ شاہی لشکر کے ساتھ لکھنوتی گئے۔ یہ ایک بہت دشوار گذار اور طویل سفر تھا اور بنگال کو جانے والے راستے بھی برسات کی وجہ سے خراب ہو گئے تھے، لیکن اس کے باوجود بلبن نے ہمت نہیں ہاری اور ایک سال سے زیادہ عرصے کی مسافت طے کر کے لکھنوتی پہنچ گیا۔ جہاں امیر خسرو نے اس سفر کا بیان کیا ہے، اُس حصے کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں بہت زیادہ پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا، مگر وہ بغرا خاں کی خوشنودی حاصل کرنے اور اس کے احسانات کا بدلہ چکانے کے لیے یہ سفر جاری رکھنے پر مجبور تھے۔

طغرل مغیث الدین نے جب شاہی لشکر کے ساتھ غیاث الدین بلبن کی آمد کی خبر سنی تو بھاگ کر "جاج نگر" کے علاقے میں پناہ لی، مگر شاہی لشکر کے ایک دستے نے اس کا پتا لگا کر حملہ کر دیا جس میں وہ مارا گیا۔ امیر خسرو نے مسرت و شادمانی کے اس موقع پر ایک طویل نظم "فتح نامہ" بھی لکھی تھی، اگرچہ اس قسم کے موضوع پر کوئی نظم لکھنے کا ان کا

پہلا تجربہ تھا، مگر اس کے باوجود وہ پوری طرح کامیاب ہوئے۔ غیاث الدین بلبن
نے بغرا خاں کو "چتر سرخ" سے سرفراز کیا اور اسے اور اس کے سکریٹری شمس الدین دبیر
کو بہت سے مشورے، نصیحتیں اور ہدایات دے کر خود دہلی کے لیے روانہ ہو گیا۔ جب
شاہی لشکر کوچ کرنے لگا تو امیر خسرو نے بھی دہلی واپسی کا ارادہ ظاہر کیا، ہر چند
شہزادہ بغرا خاں اور اس کے سکریٹری شمس الدین دبیر نے انھیں روکنے کی بہت
کوشش کی، مگر ایک تو بنگال کی مرطوب آب و ہوا راس نہ آئے اور دوسرے دہلی
سے انھیں جو عقیدت تھی، اس کی وجہ سے انھوں نے ان دونوں کی خدمت میں معذرت
پیش کی، اور آخر کار شاہی لشکر کے ساتھ دہلی واپس آ گئے۔

خانِ شہیدؒ

جب سلطان غیاث الدین بلبن فتحمندی اور کامیابی کے جذبات سے سرشار ہو کر لکھنوتی سے دہلی پہنچا، تو بہت ہی شاندار جشن منایا گیا، جس میں شرکت کرنے اور بادشاہ کو مبارکباد دینے کے لیے دور دراز صوبوں سے بھی والیان ریاست اور امرائے سلطنت آکر جمع ہو گئے تھے اور اس مبارک موقع پہ بلبن کا ولیعہد اور ملتان کا حاکم شہزادہ محمد بھی دہلی آیا ہوا تھا۔ شہزادہ محمد ہر سال ڈھیر سامال و متاع اور ہیرے جواہرات لیکر باپ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا اور اس بار بھی اس نے بہت سے خزانہ اور مغلوں سے لڑائیوں میں ہاتھ لگے ہوئے تاتاری گھوڑے بادشاہ کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کیے، اور اس کی اسی سعادت مندی کی وجہ سے بلبن اسے بے حد عزیز رکھتا تھا۔ وہ بہت ہی بہادر، شریف، نیک طینت، سعادت مند اور شائستہ انسان تھا اور علما و فضلا اور بزرگان دین کی بڑی عزت کرتا تھا اور بہت پڑھا لکھا، علم دوست اور ادب نواز بھی تھا۔

دہلی میں اپنے قیام کے دوران شہزادے نے جب امیر خسرو کی شاعری کی شہرت سنی تو اسے ان کا کلام سننے کا اشتیاق ہوا، اور اس کی اس خواہش پر ایک دن خسرو اپنا کلام لیکر اس کی خدمت میں حاضر ہوئے، جب شہزادے نے ان کا کلام سنا تو فن کی پختگی اور تخیل کی بلند پروازی دیکھ کر حیران رہ گیا، اس نے پہلی ہی نظر میں ان کی علمی لیاقت اور شاعرانہ کمال کا اندازہ لگا لیا اور ان سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ اس کے ساتھ ملتان چلیں۔ چونکہ اس وقت تک بغرا خاں سے امیر خسرو کا تعلق منقطع ہو چکا تھا اور اس بات کی توقع بھی نہ تھی کہ غیاث الدین بلبن کے دربار میں ان کی بہت زیادہ پذیرائی ہو گی، اس لیے انھوں نے اس کی پیشکش بخوشی قبول کر لی اور کچھ دنوں کے بعد شہزادے کے ساتھ ملتان چلے گئے۔ شہزادہ محمد خاں کی فطرت میں وہ

خودسری اور نخوت نہیں تھی، جو عام طور سے شہزادوں اور امیرزادوں میں ہوا کرتی تھی، وہ خسرو سے بے حد متاثر تھا اور اس کے دل میں ان کے لیے بڑی قدر و منزلت تھی، خسرو بھی اسے دل و جان سے چاہتے تھے، یہ دونوں ایک دوسرے کے آقا اور ملازم ہونے کی بجایے، سچے اور بہترین دوست تھے، گویا امیر خسرو ملتان کیا گیے کہ ان کی زندگی میں بہار آگئی۔

امیر خسرو اور سید حسن سنجری (۱) کی دوستی ایسی مثالی اور مشہور تھی کہ دونوں ایک جان و دو قالب سمجھے جاتے تھے، اور یہی وجہ تھی کہ جب شہزادہ ملتان جانے لگا، تو خسرو کی دلبستگی کا خیال کر کے حسن کو بھی اپنے ساتھ لیتا گیا، چنانچہ حسن کے شاعرانہ کمال کے بیان میں پروفیسر وحید مرزا یوں رقمطراز ہیں:

"... . . ملتان کے دربار میں خسرو کے علاوہ سب سے زیادہ مشہور شاعر سید حسن سنجری تھے، یہ تقریباً خسرو کے ہمعمر تھے اور غزل گوئی میں خصوصاً کمال رکھتے تھے، اسی مناسبت سے انھیں "سعدیٔ ہند" بھی کہا جاتا تھا، بعض نقادوں کا تو یہ خیال ہے کہ وہ غزل میں خسرو سے بھی بازی لے گیے تھے، لیکن اگرچہ اسمیں اختلاف کی گنجایش ہے، یہ ضرور ماننا پڑتا ہے کہ سید حسن کے کلام میں ایک سادگی اور بیساختگی ایسی ہے جو بہت کم شعرا کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ خسرو اور حسن کے بظاہر بہت اچھے تعلقات تھے اور خسرو ان کی بہت قدر کرتے تھے، چنانچہ "دیباچہ غرۃ الکمال" میں ہندوستان کے باکمال شعرا کا ذکر کرتے ہوے انھوں نے حسن کا نام بھی لیا ہے (۲)۔"

پروفیسر وحید مرزا آگے چل کر خسرو اور حسن کے تعلقات کی نوعیت کے متعلق لکھتے ہیں:

---

(۱) وحید مرزا نے "سید حسن سنجری" اور شبلی نے "حسن دہلوی" لکھا ہے مگر یہ دونوں نام ایک ہی شخص کے ہیں

(۲) امیر خسرو مولفہ وحید مرزا (ص ۷۰)

"...... لیکن وہ قصہ عشق اور محبت کا جسے "فرشتہ" اور بعض اور تذکرہ نویسوں نے نقل کیا ہے، میرے خیال میں زیادہ قابل اعتبار نہیں ہے۔ کیونکہ خسرو کے کلام سے کہیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان کے اور حسن کے درمیان کوئی ایسا رشتۂ الفت قایم ہو گیا تھا جسے عشق کے نام سے تعبیر کر سکیں (۱) ...... بہر حال خسرو اور حسن کی دوستی تسلیم کرنے میں کسی کو تامل نہیں ہو سکتا کیونکہ "افضل الفواید" میں خسرو اکثر ان کے نام کے ساتھ "برادرم" کا لفظ استعمال کرتے ہیں.... (۲) "

ملتان ایک عرصہ دراز سے صوبہ سندھ کا پایۂ تخت رہا تھا اور شہزادہ محمد کی حکومت کے زمانے میں اس کی عظمت میں چار چاند لگ گیے تھے، کیونکہ شہزادے کی سخاوت اور قدردانی کی شہرت سن کر دور دراز ملکوں سے بڑے بڑے علماء فضلا اور شعرا دا اس شہر میں آکر جمع ہو گیے تھے، اور مذہبی دنیا میں خواجہ بہاءالدین زکریا ملتانی کے صاحبزادے خواجہ صدرالدین ملتانی نے تبلیغ ہدایت کی شمع روشن کر رکھی تھی، اس لحاظ سے خسرو کی دلچسپی کا کوئی ایسا سامان نہ تھا، جو ملتان میں موجود نہ تھا۔

ایک روایت کے مطابق شہزادہ محمد نے سعدی شیرازی کو دو بار ملتان آنے کی دعوت دی تھی، مگر انھوں نے بڑھاپے کا عذر پیش کیا اور اپنے خط میں امیر خسرو کے کلام کی تعریف کرتے ہوئے شہزادے کو ان کی سرپرستی اور قدردانی کی تاکید لکھ کر بھیج دی تھی۔ جس کی وجہ سے خسرو اور زیادہ توجہ کا مرکز بن گیے تھے۔ ان سب سامانِ عیش و دلچسپی اور قدر و منزلت کے باوجود خسرو کو ہر وقت دہلی کی یاد ستاتی رہتی، اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ فطرتاً بہت جذباتی انسان تھے اور اپنے اعزہ و اقارب اور خصوصاً اپنی والدہ سے دوری برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ خسرو کو دہلی سے عشق کی حد تک محبت تھی، وہ اکثر یہاں کے گلی کوچوں اور بازاروں کا ذکر بہت ہی

(۱) امیر خسرو مولفہ وحید مرزا (ص ۰۰)
(۲) " " " (ص ۴۲)

عقیدت سے کرتے اور اس کی یاد میں تڑپتے رہتے تھے۔ دہلی سے خسرو کو جو غیر معمولی تعلق خاطر تھا، اس کا ذکر کرتے ہوئے وحید مرزا نے امیر خسرو ہی کے قلم سے لکھا ہوا مندرجہ ذیل اقتباس نقل کیا ہے:

"ایک وہ زمانہ تھا کہ میرا مسکن قبۂ اسلام تھا جو ہفت اقلیم کے بادشاہوں کا قبلہ ہے، یعنی وہ دہلی جو ہمشیرۂ آسمان ہے اور روے زمین پر بہشت بریں کا ایک ٹکڑا ہے، تو آسمان اس پر اپنا مبارک سایہ ڈالے ہوئے ہیں اور ہفت اقلیم اس کے دروازے کا حلقہ ہیں۔ اس کے بلند قصر آسمان سے باتیں کرتے ہیں اور سورج پر بھی سایہ ڈالتے ہیں، اور اس کے بازاروں میں آدمیوں کا اتنا ہجوم رہتا ہے کہ مردم چشم کو بھی دیکھنے والی آنکھ میں جگہ نہیں ملتی، اس کے سرسبز میدانوں میں پھول کھل رہے ہیں، اور اس کے چشمے چمکدار آنکھوں سے بھی زیادہ صاف اور روشن ہیں۔ جن کا بہتا ہوا پانی آبِ حیات کی طرح خوشگوار اور نبات سے پیتے ہوئے دودھ کی طرح شیریں ہے، حوضِ سلطان ایسا روشن ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ چاندی کو پگھلا کر پتھر میں ڈال دیا ہے، اس کے باغات میں تماشائیوں کا ہجوم، جن میں ہر ایک لالہ رخسار، بناگوش کی وہ چمک دمک کہ کان کے موتیوں کی آب کو بھی ماند کرے، عود اور رباب کے نغمے جو اس کے باغوں میں بلند ہوتے ہیں، ایسے شیریں کہ درخت مخمور ہو جائیں اور چشمے اونگھنے لگیں۔ وہاں میرے دن سیر اور تماشے میں اور راتیں ایک محبوب کی صحبت میں بسر ہوتی تھیں شاید اس گلستان کے لیے میرا وجود بار تھا کہ تقدیر نے مجھے اس خارستان میں لاکر مقید کر دیا، قلعہ کیا ہے، ایک دہکتا ہوا تنور ہے..."(۱)

بہرحال امیر خسرو پانچ سال تک ملتان میں رہے اور اس دوران علمی و ادبی مجلسوں

---

(۱) امیر خسرو ص ۶۸ – ۶۷

کو اپنی گوناگوں صلاحیتوں سے گرماتے رہے، اور شہزادے کی سرپرستی اور یہاں کے علما و فضلا کی صحبت میں انھوں نے بہت کچھ سیکھا اور اپنے علم اور مشاہدے اور تجربے میں اضافہ کیا اور بقول خود، ملتان کے پانچوں دریاؤں کو اپنے اشعار کے سمندروں (بحروں) سے پانی دیتے رہے (۱) امیر خسرو ملتان میں پانچ سال یعنی ۶۷۸ ہجری سے ۶۸۳ ہجری تک، دہلی کی تمام تر یادوں اور اپنی طبیعت کی بیزاری کے باوجود اس وجہ سے رہ گئے کہ اس دوران سال میں ایک مرتبہ انھیں شہزادے کے ساتھ دہلی آنے کا موقع مل جاتا تھا (۲) اور اس کے علاوہ سید حسن سنجری جیسا دوست بھی ان کے ساتھ ہر وقت رہتا تھا، لیکن زندگی کی یہ شباب آور بہار بھی زیادہ دنوں تک ان کا ساتھ نہ دے سکی، کیونکہ جب سے شہزادہ ملتان کا حاکم ہوا تھا، اسی وقت سے کبھی بھی اسے اطمینان و سکون کی سانس لینے کا موقع نہ مل سکا، اسے آیے دن مغل حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کے لیے میدان جنگ میں جانا پڑتا تھا مگرچہ شہزادے کی شجاعت و دلیری اور فکر و تدبر کے باعث مغلوں کا کوئی حملہ بھی کامیاب نہیں ہوا، اور اس کی قابلیت اور جوانمردی کا سکہ مغلوں کے دلوں میں بیٹھ چکا تھا لیکن اس کے باوجود اپنی سابقہ شکستوں کا انتقام لینے کے لیے مغل اکثر و بیشتر موقع پاکر حملہ کرتے رہتے تھے۔

۶۸۳ ہجری کے آخری مہینے ذی الحجہ میں ایک مغل سردار، تیمور خاں نے ملتان کی سرحدوں پر اچانک حملہ کر دیا۔ جب شہزادے کو اس کی خبر ملی تو وہ جس حالت میں تھا، اسی حالت میں کسی فوجی تیاری کے بغیر مقابلے کے لیے چل پڑا۔ شہزادے کا لشکر صبح سویرے روانہ ہو کر دوپہر کے وقت دریائے راوی کے کنارے پہنچ گیا۔ جس کے دوسرے کنارے پر تیمور خاں خیمہ زن تھا، اس نے دریا عبور کرکے شہزادے کی فوجوں پر حملہ کر دیا۔ ہندوستانی فوج کی تعداد مقابلے میں بہت قلیل تھی، اس

---

(۱) امیر خسرو، ص ۲۲

کے باوجود تیمور خاں اور اس کے لشکر کی پسپائی ہوئی، میدان جنگ کا یہ نقشہ دیکھ کر ہندوستانی فوجیں دوراندیشی کے بغیر ان کا تعاقب کرنے لگیں۔ جس کی وجہ سے شہزادے کے آس پاس صرف پانچ سو سپاہی رہ گئے، شہزادے نے میدان جنگ کو جیت لینے کا اطمینان کر کے اپنے موجودہ سپاہیوں کے ساتھ جیسے ہی نماز ظہر کی نیت باندھی، ویسے ہی ایک مغل سردار نے اپنی کمین گاہ سے نکل کر دو ہزار سواروں کے ساتھ نماز پڑھنے والوں پر حملہ کر دیا، یہ حملہ ایسا اچانک تھا کہ ہندوستانی فوج اس کی تاب نہ لاسکی اور اپنے بہت سے جانباز سپاہیوں کے ساتھ شہزادہ محمد بھی مارا گیا، اسی وجہ سے اسے "خان شہید" کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے، مغلوں نے شہزادے کی شہادت کے بعد جن بھاگتے ہوئے ہندوستانی سپاہیوں کو گرفتار کیا تھا، انھیں میں امیر خسرو بھی قیدی بنا لیے گئے (۱)، لیکن خسرو کو مغلوں کی قید سے بہت جلد رہائی مل گئی، چنانچہ اپنی مثنوی "دول رانی خضر خاں" میں اپنی گرفتاری اور رہائی کا بیان انھوں نے اس طرح کیا ہے:

"ان دنوں جب میں گنہگار بندہ اب سے دو مغلوں کی قید میں گرفتار ہو گیا تھا تو ریگستان میں سرگرداں چلا جا رہا تھا اور گرمی کی شدت سے مرد نگ کی طرح ابل رہا تھا، چلتے چلتے میں اور میرا ساتھی مغل سوار دونوں پیاسے راستے میں ایک چشمے پر پہنچے لیکن اگرچہ پیاس اور گرمی سے میرا تن بدن پھنک رہا تھا، میں نے اس سلگتی ہوئی آگ پر پانی سے تیل ڈالنا مناسب نہ سمجھا بلکہ ذرا سے لب تر کر لیے، جس سے دل اور جگر میں کچھ ٹھنڈک پیدا ہو گئی۔ مگر اس پیاسے سوار اور اس سے زیادہ پیاسے گھوڑے نے خوب سیر ہو کر پانی پینا شروع کیا اور اتنا پانی پیا کہ جلد ہی دونوں گر کر ہلاک ہو گئے (۲)"

خسرو کو جس دن مغل سوار کی قید سے آزادی ملی، اسی دن وہ ملتان واپس آ گئے

(۱) امیر خسرو مولفہ وحید مرزا (ص ۲۷)، (۲) امیر خسرو مولفہ وحید مرزا (ص ۶۸، ۶۷)

اور یہاں آکر جو منظر انھوں نے دیکھا، اس کی تاب نہ لا سکے، ہر گھر میں عزیزوں کی موت سے کہرام برپا تھا اور لوگوں کی ساری امیدوں پر پانی پھر چکا تھا، اس کے علاوہ ایسے ہونہار، ہر دلعزیز اور لایق و فایق شہزادے کی شہادت نے خاص طور سے خسرو کی بنی بنائی دنیا اجاڑ دی تھی. شبلی نعمانی شہزادے کی لایقیت اور شرافت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"..... وہ نہایت قابل، صاحب علم، فیاض اور قدر دان علم و فن تھا، تہذیب و متانت کا یہ حال تھا کہ جب دربار میں بیٹھتا تو گو کبھی کبھی دن کا دن گذر جاتا تھا، لیکن زانو نہیں بدلتا تھا، اس کی مجلس میں ہمیشہ شاہنامہ، دیوان خاقانی، انوری، خمسۂ نظامی کے اشعار پڑھے جاتے تھے، ایک بیاض تیار کی تھی جس میں اپنے مذاق کے موافق بیس ہزار شعر انتخاب کر کے درج کیے تھے، تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ ان اشعار کے حسنِ انتخاب پر امیر خسرو اور حسن دہلوی (حسن سنجری) بھی داد دیتے تھے.

یہ بیاض ایسی نادر چیز تھی کہ جب شہزادہ کا انتقال ہوا تو سلطان غیاث الدین بلبن نے اپنے خاص دوات دار امیر علی کو دی، امیر علی کے بعد امیر خسرو کے ہاتھ آئی، ارباب ذوق اس کی نقلیں لیتے تھے اور بیاضوں میں درج کرتے تھے (۱)"

خان شہید کی شہادت سے امیر خسرو کے دل کو کس قدر صدمہ پہنچا اور وہ اس اندوہناک واقعے سے کتنے متاثر ہوئے، اس بات کا اندازہ ان کے اُن دو مرثیوں کو پڑھ کر ہوتا ہے، جنھیں انھوں نے شہزادے کی موت پر لکھا تھا، ان مرثیوں میں انھوں نے ملتان سے شہزادے کی روانگی، میدان جنگ میں اس کی اور اس کے ساتھیوں کی دلیری اور جانبازی، مغلوں کی پسپائی، ہندوستانی فوج کی نماز ظہر کی ادائیگی، مغلوں کا غیر متوقع حملہ، شہزادے کی شہادت اور اہل ملتان کے رنج و الم کی بہت ہی پیاری تصویر کھینچی ہے. شبلی نعمانی نے ایک مرثیے کے چند اشعار بھی نقل کیے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں.

---

(۱) برنی (ص ۳۸)

واقعاست این یا بلا از آسمان آمد پدید
آفت است این یا قیامت در جهان آمد پدید

راه در بنیاد عالم داد سیل فتنه را
رخنه کاسال در هندوستان آمد پدید

مجلس یاران پریشان شد چو برگ گل ز باد
برگ ریزی گوئی اندر بوستان آمد پدید

بسکه آب چشم خلق شد روان در چار سو
پنج آبی دیگر اندر ملتان آمد پدید

جمع شد سیاره در چشم مگر طوفان شود
چون به برج آبی انجم را قران آمد پدید

من نخواهم جز جهان جمعیت و این کی شود
خود محال ست این بنات النعش پروین کی شود

تا چه بد کرد شاه از ملتان لشکر کشید
تیغ کافرکش برای کشتن کافر کشید

آنچه حاضر بود لشکر لشکر دیگر نجست
زانکه رستم را نشاید منت لشکر کشید

چون خبر کردندش از دشمن بدان قوت کہ داشت
بی محابا خشم در سر کرد و رایت در کشید

یک کشش از مولتانش تا بہ لاہور او فتاد
یعنی اندر عہد من کافر تو اندر سر کشید

آنچنان رنگین کنم امسال خاک از خون شان
کز زمین بایہ شفق را گونۂ احمر کشید

او درین تدبیر و آگہ نی کہ تدبیر فلک
صفحۂ تدبیر را خط مشیت در کشید

تا چہ ساعت بد کہ کافر بر سر لشکر کشید
جوق جوق از آب بگذشتند و ناگہ در رسید (۱)

امیر خسرو کے مرثیوں کا اثر ملتان کے عوام پر ایسا پڑا کہ لوگ گھر گھر میں ان کے اشعار پڑھتے اور اپنے مقتول عزیزوں اور احباب کا نوحہ کرتے تھے، اور کہا جاتا ہے کہ خسرو نے جب دہلی کے دربار میں حاضر ہو کر یہ مرثیے پڑھے تو سننے والوں پر بے اختیار ایسی رقت طاری ہو گئی کہ جو شخص بھی مرثیہ کے اشعار سنتا، وہ بے اختیار رو پڑتا تھا۔ دہلی کے شاہی محل سے ہر کوچہ و بازار تک پر سوگواری کا سماں چھا گیا تھا، اور یہ شہزادہ محمد کی شہادت اور خسرو کے درد انگیز اور پُر اثر مرثیے ہی کا اثر تھا کہ غیاث الدین بلبن زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکا (۲)۔

امیر خسرو کو شہزادہ محمد کی شہادت کا غم ایسا تھا کہ دنیا کی ساری رنگینیوں اور رعنائیوں کی طرف سے ان کا جی اچاٹ ہو گیا اور عیش و عشرت کی محفلوں میں ذرا بھی دل نہیں لگتا تھا، چنانچہ برنی نے خان شہید سے خسرو کی عقیدت و محبت کا بیان ان الفاظ میں کیا ہے:

"... اس کے انتقال کے بعد عرصے تک خسرو اپنے دوستوں سے کہا کرتے تھے کہ اگر ہماری قسمت اچھی ہوتی تو آج شہزادہ مالک تاج و تخت ہوتا (۳)۔"

(۱) شعر العجم دوسری جلد (ص ۱۱۴-۱۱۵) (۲) ایضاً (ص ۱۱۵) (۳) برنی (ص ۳۸)

امیر علی سرجاندار

امیر خسرو ملتان سے دہلی آئے اور پھر جلد ہی اپنی پیدائشی جگہ پٹیالی چلے گئے کیونکہ وہاں ان کی والدہ رہا کرتی تھیں، اور ایک عرصے تک دریائے گنگا کے کنارے اپنا وقت گذارتے رہے، لیکن جب خان شہید کے غم کا بوجھ ذرا ہلکا ہوا تو انھوں نے پھر دہلی کا رخ کیا اور امیر علی سرجاندار کی ملازمت اختیار کر لی۔ امیر علی سرجاندار (۱) عیش و عشرت کی محفلیں خوب منعقد کرتا اور جی کھول کر داد عیش دیتا تھا، اور دریا دلی اور سخاوت اور علما و فضلا کی قدر دانی کے لیے حاتم طائی کی طرح مشہور تھا، اسی لیے اسے "حاتم خاں" کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ وہ امیر خسرو کی علمی فضیلت اور شاعرانہ کمال کا پہلے ہی سے معترف تھا اور اس بات کا خواہشمند بھی کہ وہ اس کے دربار سے وابستگی پیدا کر لیں۔ چنانچہ اب جو امیر خسرو نے اس سے اپنا تعلق پیدا کیا تو اس کی مسرتوں کی انتہا نہ رہی، اس نے ان کی خاطر و مدارت دل کھول کر کی اور ان کے دل سے خان شہید کی جدائی کے غم کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش میں بھی کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔

حاتم خاں کے دربار سے امیر خسرو کی وابستگی کا وہی زمانہ ہے، جب دہلی کے تخت پر غیاث الدین بلبن کا پوتا اور بغرا خاں کا بیٹا، معزالدین کیقباد حکومت کر رہا تھا۔ کیقباد اور اس کے وزیر نظام الدین نے بہت چاہا کہ خسرو شاہی دربار سے وابستہ ہو جائیں مگر انہوں نے اس پیشکش کو قبول نہیں کیا اور حاتم خاں کی ملازمت کو شاہی دربار کی ملازمت پر ترجیح دی، کیونکہ ان کا دل وزیر نظام الدین کی طرف سے صاف نہ تھا۔ بلبن کو شہزادہ محمد سے بڑی محبت تھی، اس لیے اس نے قدرتی طور پر شہزادہ مرحوم کے بیٹے کیخسرو کو اپنا ولیعہد نامزد کر دیا۔ جو اکابر سلطنت اس وقت موجود تھے ان میں فخرالامرا کوتوال دہلی اور بلبن کے بھتیجے نظام الدین وزیر کے نام قابل ذکر ہیں۔ بلبن

---

(۱) شبلی نے شعرالعجم کی دوسری جلد میں امیر علی سرجاندار کا نام — خان جہاں — لکھا ہے جو شاید اس کا خطاب تھا۔

نے کیخسرو کو ولیعہد نامزد کر کے خان شہید کو ملتان کا حاکم بنا کر بھیج دیا۔ لیکن بادشاہ کے انتقال کرتے ہی کوتوالِ دہلی اور نظام الدین وزیر نے امرائے سلطنت سے سازش کر کے کیخسرو کو ملتان میں نظربند کر دیا اور بغرا خاں کے جوان سال بیٹے معز الدین کیقباد کو دہلی کے تخت پر بٹھا دیا۔ اس واقعہ سے امیر خسرو کو سخت صدمہ پہنچا اور اسی وجہ سے انھوں نے کیقباد اور نظام الدین کی پیشکش قبول کرنے سے عذر پیش کیا۔

حاتم خاں کو جب کیقباد نے "اودھ" کا صوبہ دار مقرر کیا تو اس نے امیر خسرو کو بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ چلے گئے۔ مگر ان کا دل وہاں بھی نہ لگ سکا۔ وہ اپنی والدہ سے بے حد محبت کرتے تھے اور دہلی سے ان کے جو خطوط جاتے تھے، انھیں پڑھ کر امیر خسرو تڑپ اٹھتے تھے اور دہلی کی یاد انھیں اور زیادہ ستانے لگی تھی۔ آخر کار وہ دو سال تک وہاں رہ کر امیر حاتم خاں کی اجازت سے دہلی واپس آ گئے۔ کیونکہ اس دہلی سے، جسے وہ بے حد عزیز رکھتے تھے جدا رہ کر ان کے دل کو سکون و اطمینان نہ مل سکا۔ لیکن اس کے باوجود حاتم خاں کی مہربانیوں اور نوازشوں کی یاد ان کے دل سے محو نہ ہوئی چنانچہ وہ "قران السعدین" میں لکھتے ہیں:

خان جہان حاتم مفلس نواز
گشت بہ اقطاع اودھ سرفراز
من کہ بُدم چاکر او پیش ازان
کرد کرم آنچہ کہ بد بیش ازان
تازہ جہان بخشش خاطر فریب
بندہ شدہ لازمہ آن رکیب

در اودم بروز لطف چنان
کیست کہ از لطف بتابد عنان
در اودھ از بخشش او تا دو سال
ہیچ غمم تا نبود در [illegible] سال

پانچواں باب

امیر خسرو اور سلاطینِ دہلی

معزالدین کیقباد

معزالدین کیقباد جب دہلی کا حکمراں ہوا، اس وقت اس کی عمر سترہ، اٹھارہ سال کی تھی، اس کی تعلیم و تربیت اگرچہ بلبن کی سخت نگرانی میں ہوئی تھی، لیکن تختِ سلطنت پر بیٹھتے ہی، اس کی دبی اور کچلی ہوئی ساری خواہشیں بیک وقت سارے بند توڑ کر آزاد ہوگئیں، اور وہ عیش پرستی کی اس انتہا کو پہنچ گیا کہ اس کی رنگین مزاجی اور عیاشی کی دلکش داستانیں آج تک مشہور ہیں۔

وہ دہلی، جہاں کبھی فنونِ سپہ گری اور مردانہ جوہر کا مظاہرہ ہوتا تھا، اب رفتہ رفتہ ایک عشرت کدے میں تبدیل ہونے لگی اور شاہی محل کے ہر دروازے اور ہر راہداری میں نیم عریاں کنیزوں کا چھلکتا ہوا حسن و شباب نظر آنے لگا۔ ساز چھڑنے لگے، قدم تھرکنے لگے اور جنسی ہوس سے بھرپور نغمے اُبلنے لگے۔ رقاصاؤں کا ہر عضوِ بدن لچکتا اور بوٹی بوٹی تھرکتی، ور ان کے گھنگھروؤں کی کھنک سے پیدا ہونے

والی مدہوش کن موسیقی محل کی ساری فضا پر چھا جاتی اور خواب گاہ سے دربارعام تک شراب و نگار و شباب کی جلوہ سامانیاں ہر ہر قدم پر دعوت گناہ دیتیں۔ ایک بادشاہ ہی کیا، چند کو چھوڑ کر سارے کے سارے امرائے سلطنت لہو و لعب میں مبتلا تھے، ظاہر ہے کہ جب امیر کارواں ہی راستے سے بہک جایے تو اہلِ کارواں کا کیا حال ہو گا۔ یہی وجہ تھی کہ امرا میں سے جو لوگ دانشمند اور سلطنت کے خیر خواہ تھے وہ حالات کی ناساعدت کی تاب نہ لاکر گوشہ نشین ہو گیے تھے۔ یا ـــ "چلو تم ادھر کو، ہوا ہو جدھر کی" ـــ کے نظریے پر عمل پیرا تھے۔ نظام الدین وزیر کے علاوہ بھی امرا کا ایک گروہ تھا جس کے نرغے میں بادشاہ گھرا ہوا تھا، ایسے لوگ اُسے نیک مشورے دینے کے بجایے اور زیادہ عیش و عشرت میں مشغول رکھنے کی کوشش کرتے، تاکہ اس طرح وہ خود سلطنت کے معاملات میں زیادہ سے زیادہ دخیل ہو سکیں۔ دہلی کی بربادی کے یہی وہ آثار تھے جنھیں دیکھ کر بغرا خان نے سلطنت پر قبضہ جما لینے کے ارادے سے لکھنوتی سے دہلی کی طرف کوچ کیا، جب کیقباد نے یہ خبر سنی تو وہ بھی اپنے شاہی لشکر کے ساتھ باپ سے جنگ کرنے کے لیے وہیں سے لکھنوتی کی جانب چل پڑا، کچھ دنوں بعد دونوں فوجوں کا اتصال اس صورت میں ہوا کہ "دریایے سرجو یا سریو" کے ایک کنارے پر شاہی لشکر اور دوسرے کنارے پر بغرا خانی لشکر خیمہ زن ہو گیے۔ دونوں طرف کی فوجوں کا جوش و خروش دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ کشت و خون کا بازار گرم ہو جایے گا، لیکن بعض خیر خواہوں اور دانشمندوں کی بروقت مداخلت سے باپ بیٹے کے درمیان پرخون آشام جنگ ہوتے ہوتے رہ گئی

اس موقع پر دیگر امیروں کی طرح حاتم خاں بھی وہیں سے کیقباد کے ساتھ گیا تھا اور اس کی ایما پر امیر خسرو بھی شاہی لشکر کے ساتھ ہو گیے تھے۔ انھوں نے جنگی تیاریوں اور مصالحت کی کوشش کے سارے واقعات و مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے چونکہ شاعر تھے اور احساس دل بھی۔ اسی لیے ان حالات و واقعات کا بہت گہرا اثر قبول کیا تھا۔ غیاث الدین بلبن کی اولادوں سے امیر خسرو کو جو تعلق خاطر تھا، اس کی بنیاد پر یہ اندازہ بحسن و خوبی کیا جا سکتا ہے کہ بغرا خاں اور کیقباد کے درمیان مصالحت

سے انھیں کس قدر بے پایاں مسرت حاصل ہوئی ہو گی۔ لیکن اس وقت ان کی ساری خوشیوں پر پانی پھر گیا جب کیقباد نے "اودھ" پہنچکر حاتم خاں کو وہاں کا گورنر مقرر کر دیا اور انھیں بھی مجبوراً دہلی کے بجائے امیر کے ساتھ وہیں رک جانا پڑا، لیکن جیساکہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے، وہ دو سال اَوَدھ میں گذار کر دہلی واپس آ گیے۔

امیر خسرو کو دہلی پہنچے ہوے ابھی دو دن بھی نہ ہوئے تھے کہ کیقباد نے انھیں طلب کر لیا اور چونکہ نظام الدین وزیر کا خاتمہ ہو چکا تھا اسی لیے اب دربار سے تعلق پیدا کرنے میں انھیں کوئی پس و پیش بھی نہ تھا چنانچہ ایک قصیدہ لکھ کر وہ دربار میں حاضر ہوے جسے بادشاہ نے بے حد پسند کیا اور خلعت اور بہت کچھ انعام و اکرام دے کر یہ فرمائش کی کہ دریاے سرجو کے کنارے پر باپ بیٹے کی دلچسپ ملاقاتوں اور دونوں کے درمیان مصالحت کے واقعے کو وہ نظم کے پیرایے میں بیان کریں اور انھوں نے چھے مہینے کی مسلسل فکری کاوش کے بعد رمضان سنہ ۶۸۸ ہجری میں ایک طویل مثنوی لکھی، جس کا نام "قران السعدین" ہے۔

انھوں نے اس مثنوی میں دونوں طرف سے جنگ کی تیاریوں سے لیکر مصالحت ہونے تک کے سارے واقعات اس طرح ایک سلسلے میں نظم کیے ہیں کہ یہ مثنوی منظر کشی اور واقعہ نگاری کا بہترین نمونہ بن گئی ہے۔ اب سے پہلے خسرو غزل، قصیدہ، قطعہ، رباعی اور دوسری اصناف سخن میں اپنے تخیل کی بلند پروازی، ذہانت اور جودت طبع کا اظہار کرتے رہے تھے، اور یہ پہلا موقع تھا کہ انھوں نے ایسی طویل مثنوی لکھی تھی لیکن اس کے باوجود وہ پہلے ہی کی طرح اس مرتبہ بھی فن شعر کی تنگ اور دشوار گذار وادی سے کامیابی کے ساتھ نکل گیے یہ ان کی پہلی طبع زاد مثنوی ہے جو اپنی شعری و ادبی عظمت کے علاوہ مورخوں کے نزدیک بھی تاریخی نقطۂ نظر سے بہت اہمیت کی حامل ہے، کیونکہ انھوں نے سارے واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے اور خود بھی ان واقعات سے کماحقہٗ دلچسپی رکھتے تھے۔

معز الدین کیقباد امیر خسرو پر بڑا مہربان تھا اور اس نے انھیں، ملک الشعرا کا خطاب بھی عطا کیا تھا، خسرو کا یہ مہربان سرپرست اپنی شخصی کمزوریوں اور نظام الدین کی

بدعنوانیوں کے سبب امور سلطنت اور انتظامِ حکومت پر سے رفتہ رفتہ اپنی گرفت کھو چکا تھا، لیکن جب اسے اس بات کا احساس ہوا تو اس وقت پانی سر سے گذر چکا تھا، پھر بھی اس نے نظام الدین وزیر سے نجات پانے کے لیے اسے مروا دیا اور فیروز خلجی کو سرحدی علاقے بلاکر، "شائستہ خاں" کا خطاب دیا اور اسے 'عارض ممالک' کے عہدے پر مامور کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ایک طرف کیقباد اپنی طویل اور شدید علالت کے سبب چلنے پھرنے سے معذور ہو کر بستر مرگ پر پڑا ہوا اپنی سانسیں گن رہا تھا اور دوسری طرف ترکوں نے سازش کر کے اس کی زندگی ہی میں اس کے بیٹے 'کیامورث' کو تخت پر بٹھادیا تھا اور تیسری طرف سارے امرائے سلطنت اقتدار پر قبضہ جما لینے کے لیے ایک دوسرے سے برسرِپیکار تھے۔ اقتدار کی جنگ والے سرداروں میں فیروز خلجی کا گروہ بہت مضبوط اور طاقتور تھا، آخر کار ایک خون آشام اور خوفناک جنگ کے بعد ترکوں کی شکست ہوئی اور خلجیوں کے حصے میں فتح آئی اور اب شائستہ خاں فیروز خلجی نابالغ بادشاہ 'کیامورث' کا اتالیق بن گیا۔ اس اثنا میں ایک ترک نے کسی ذاتی عداوت کی بنیاد پر کیقباد کو محل کے اندر بستر علالت پر ہی بڑی بے رحمی سے قتل کر دیا اور اس دردانگیز اور عبرتناک واقعے کے بعد فیروز خلجی نے 'کیامورث' کو معزول کر کے تختِ سلطنت پر اپنا قبضہ جما لیا۔

جلال الدین خلجی

سلطان جلال الدین خلجی اگرچہ ستر برس کی عمر میں ہندوستان کا بادشاہ ہوا تھا، لیکن وہ بوڑھا ہو کر بھی جوان تھا اور زندگی کی بھرپور تو انائیوں سے دلچسپی لینے اور لطف اندوز ہونے کی ساری صلاحیتیں اس میں ابھی بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ وہ بھی معز الدین کیقباد کی طرح عیش و طرب کی گرما گرم محفلیں آراستہ کرتا، ودن کی رعنائیوں اور زیبائیوں سے پوری طرح لطف اندوز ہوتا، چنانچہ خسرو کے ایک معاصر مورخ ضیاء الدین برنی نے ان محفلوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"جب ساقی جام لبریز کر دیتے اور خوبصورت رقاصاؤں کے بدن تھرکنے لگتے تو سلطان خوشنوا خسرو کی غزل چھیڑتا۔ ان محفلوں میں، جو کوشش تمام خاکی تصور کیے جا سکے، بے جان چیزوں میں بھی جان پڑ جاتی اور افسردہ دلوں میں شگفتگی آ جاتی۔"

ضیاء الدین برنی کو بھی بادشاہ کے عیش و طرب کی ان مجلسوں میں کبھی کبھی شرکت کا موقع مل جاتا تھا، چنانچہ وہ اپنی جوانی کے دنوں کو یاد کر کے بہت ہی مسرت بھرے انداز میں لکھتا ہے:

"یہ بوڑھا گنہگار، جو عمر اپنے نا امیدی میں سرگرداں ہے اور جو اب بڑھاپے سے اتنا نحیف و لاغر ہو گیا ہے کہ ہوا کا ایک جھونکا یا دھوئیں کا ایک مرغولہ معلوم ہوتا ہے، جب ان مجلسوں کا ذکر لکھ رہا ہے تو اس کا دل چاہتا ہے کہ گلے میں زنار پہن لے اور ماتھے پر برہمنوں کا ٹیکہ لگائے، ان خوب رو نوجوانوں اور حسین عورتوں کی یاد میں جن کا ناچ رنگ اس نے تمام عمر دیکھا اور سنا ہے۔ ہاں میرا جی چاہتا ہے کہ اپنے چہرے کو سیاہ کروں اور اقلیم حسن کے بادشاہوں اور آسمانِ خوبی کے سورجوں کو ماتم کرتا ہوا کوچہ و بازار میں نکل کر اپنے آپ کو ہدف ملامت و تذلیل بناؤں، اور ان کے غائب ہو جانے کے سالہا سال بعد نالہ و بکا کرتا ہوا

نکلوں، اپنے کپڑے پھاڑ ڈالوں۔ اور سر کے بال نوچ لوں اور ان کی قبروں کے پاس جان دے دوں (۱)۔"

جلال الدین خلجی کی عیش پرستی اور اس کی محفلوں کی رنگینی کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر وحید مرزا لکھتے ہیں:

"بادشاہ کا بڑھاپا تھا لیکن اس کی محفلوں کی رونق اور چہل پہل ایسی تھی کہ شاید کیقباد کو بھی نصیب نہ ہوئی ہو۔ شراب ارغوانی کے دور خوب چلتے تھے، بڑے بڑے گویئے اور موسیقی کے استاد آتے تھے اور امیر خسرو اور خواجہ حسن کی غزلیں سنا سنا کر حاضرین کو مسرور کیا کرتے تھے......۔ ان دلکش اور خوش آئندہ صحبتوں میں ارباب علم و فضل کا مجمع بھی رہتا تھا اور شاعروں کو اپنا جوہر دکھانے کا اچھا موقع مل جاتا تھا (۲)۔"

امیر خسرو اپنی علمی لیاقت اور شاعرانہ کمال کے سبب پہلے سے مشہور تھے ہی، کیقباد کے بخشے ہوئے "ملک الشعراء" کے خطاب نے ان کی شخصیت میں چاند چاند لگا دیا، چنانچہ جلال الدین خلجی جب "کیامورث" کا اتالیق تھا۔ اسی زمانے میں خسرو پر اس کی نگاہ عنایت پڑ چکی تھی اور جب وہ بادشاہ ہوا تو اس وقت بھی انھیں نظر انداز نہ کر سکا۔ بادشاہ نے خسرو کو "مصحف دار" کے عہدے پر فائز کر کے انھیں اپنا ندیم خاص بنا لیا اور امیر کا خطاب بھی دیا اور خسرو بھی بادشاہ کی محفل طرب کے لیے ہر روز ایک نئی غزل پیش کیا کرتے، جسے سن سن کر لوگ سر دھنتے تھے۔

شبلی نعمانی نے جلال الدین خلجی اور امیر خسرو کے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"......۔ وہ بڑے عظمت اور اقتدار و جاہ و جلال کا بادشاہ تھا۔ اس کے ساتھ نہایت صاحب مذاق، رنگین طبع، خوش طبع تھا، شعر بھی کہتا تھا.....(۳)"

---

(۱) برنی (ص ۲۰۰) بحوالہ "امیر خسرو" مولفہ وحید مرزا (ص ۱۱۰ - ۱۰۹)

(۲) شعر العجم، دوسری جلد (ص ۱۱۰) (۳) ایضاً (ص ۱۱۹)

"ایسے گوناگوں صاحبِ ذوق بادشاہ کے لیے امیر خسرو سے زیادہ کون موزوں ہو سکتا تھا۔ وہ عالم بھی تھے، فاضل بھی، مغنی بھی، مطرب بھی اور شاعر تو تھے ہی۔ معز الدین کیقباد کے زمانہ میں جب سلطان جلال الدین خلجی عارض تھا، اس وقت اس نے امیر خسرو کو قدر دانی کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ چنانچہ معقول مشاہرہ مقرر کر کے خاص اپنا پاس عنایت کیا تھا۔ تخت پر بیٹھا تو امیر کو ندیم خاص بنایا اور مصحف داری و امارت کا عہدہ دیا۔ اس کے ساتھ جامہ اور کمربند جو امرائے کبار کا مخصوص باس تھا، ان کے لیے مقرر کیا۔ امیر خسرو جو امیر کے خطاب سے پکارے جاتے ہیں اس کی وجہ یہی ہے۔(۱)"

جلال الدین خلجی اپنی طبیعت کی تمام تر رنگینیوں اور عیش کوشیوں کے باوجود امور مملکت کی طرف سے کبھی غافل نہیں رہا، وہ انتہائی شریف اور غیر منتقم مزاج بھی تھا۔ اکثر امرا اس کا مذاق اڑاتے اور اس کے خلاف سازشیں کرتے لیکن وہ کبھی کسی سے کچھ نہ کہتا اور یہاں تک کہ اسے ایک بار اپنے قتل کی سازش کا بھی علم ہو گیا مگر اس نے سارے سازشی امیروں کو معاف کر دیا۔ اس کی سادہ دلی اور نرم مزاجی کی وجہ سے جن امیروں کا حوصلہ بڑھ گیا تھا ان میں ایک امیر خسرو کا پہلا مربی اور "کڑا" کا حاکم ملک چھجو بھی تھا۔ چونکہ اس امیر کا دل بادشاہ کی طرف سے صاف نہیں تھا اور "کیامورث" کے بعد خود کو تخت سلطنت کا حقدار سمجھتا تھا، اس لیے اس نے کڑا میں بغاوت کر دی جسے کچلنے کے لیے خود بادشاہ نے دہلی سے کوچ کیا اور اپنے منجھلے بیٹے ارکلی خاں کو ایک لشکر کے ساتھ آگے روانہ کیا۔ ارکلی خاں جمنا اور گنگا کو عبور کر کے دریائے رہب (رام گنگا) کے کنارے پہنچا (۲)، گویا دریا کے ایک کنارے پر شاہی فوج تھی اور دوسرے کنارے پر ملک چھجو کی فوج تھی، دونوں فوجیں چند دنوں تک ایک دوسرے کے آمنے سامنے رہیں مگر جنگ نہ ہوئی، ایک روز جب باغی امیر نے بادشاہ کی آمد کی خبر سنی تو رات کے وقت چپکے سے فرار ہو گیا، لیکن ارکلی خاں نے اسے جا پکڑا اور جس حال میں اسے اور اس کے ساتھیوں

---

(۱) "شعر العجم" دوسری جلد (ص ۱۱۹)　　(۲) امیر خسرو (ص ۱۱۲ - ۱۱۱)

کو بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا، اس کا بیان پروفیسر وحید مرزا نے برنی کے حوالے سے اس طرح کیا ہے:

"۔۔۔۔۔۔ اونٹوں پر سوار تھے، ہاتھ دو شاخوں میں بند تھے ہوئے چہرے پر سیاہی ملی ہوئی، اور کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے، بادشاہ نے دیکھا تو فوراً چلا اٹھا: "یہ کیا تماشا بنایا ہے! دو شاخے فوراً کھول دو" اس کے بعد انھیں اونٹوں سے اتار کر حمام میں بھیج دیا گیا، جب نہا دھو کر اور نئے کپڑے پہن کر وہ پھر بادشاہ کے حضور میں آئے تو بادشاہ نے انھیں عذر و معذرت کا موقع ہی نہیں دیا بلکہ انھیں اپنے پاس بٹھا کر ان کے ساتھ شراب پیتا رہا اور پھر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد ان سب کی جاں بخشی کا اعلان کر کے کشلو خاں (ملک چھجو) کو ملتان کا حاکم بنا دیا۔" (۱)

امیر خسرو بھی اس مہم میں بادشاہ کے ساتھ تھے اور انھوں نے تمام حالات و واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے چنانچہ جب انھوں نے اپنے پہلے سرپرست کو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنے ہوئے دیکھا تو وہ کانپ اٹھے۔ سلطان جلال الدین خلجی کے عہد حکومت کی فتوحات اور جنگی مہموں پر مشتمل ایک طویل مثنوی "مفتاح الفتوح" (۲) لکھتے ہوئے جب خسرو ملک چھجو کی بغاوت اور اس کی سرکوبی کے واقعے پر پہنچے ہیں تو پرانے تعلقات کے سبب مروت آڑے آگئی ہے، اور وہ اسے صرف ایک "بدعہد" کہہ کر ٹال گئے ہیں:

جلال الدین فیروز خلجی جیسی فرشتہ خصلتی، نیک نفسی، نرم دلی، سادہ لوحی اور فیاضی کی مثال تاریخ کے اوراق میں بہت کم مل سکے گی، اس کی انھیں بے ضرر صفات کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اس کے بھتیجے اور داماد نے "بھیلسا" اور "دیوگیر" پر تاخت و تاراج کر کے بے پناہ دولت جمع کر لی، اور بادشاہ سے برگشتہ خاطر رہنے والے امرا کو اپنے ساتھ ملا کر اپنے بھائی الماس بیگ کے ذریعہ دہلی میں بادشاہ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اس سے ملنے اور اپنی

---

(۱) امیر خسرو (ص ۱۱۲-۱۱۱)
(۲) وحید مرزا نے "مفتاح الفتوح" اور شبلی نے "تاج الفتوح" لکھا ہے۔

خوشنودی کا اظہار کرنے کے لیے خود "کڑا" پہنچے، چنانچہ وہ اپنے وزیر احمد چپ کے سمجھانے بجھانے کے باوجود اپنے بھتیجے سے ملنے کے لیے گیا اور وہاں اس کے فریبی اور لالچی بھتیجے علاء الدین نے اسے نہایت بے رحمی سے قتل کر دیا۔

جب سلطان جلال الدین کے قتل کی خبر دہلی پہنچی، اس وقت اس کا منجھلا بیٹا ارکلیک خاں ملتان میں تھا اور اس کے بڑے بھائی خان جہانی کا انتقال ہو چکا تھا چنانچہ ملکہ نے حالات کی نزاکت دیکھتے ہوئے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے رکن الدین ابراہیم قدر خاں کے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا اور اس کے اس فیصلے کو امرا نے بھی منظور کر لیا۔ جب چھوٹے بھائی کی تخت نشینی کی اطلاع ارکلیک کو ملی تو وہ بدل ہو گیا اور اس نے علاء الدین کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی نتیجے کے طور پر علاء الدین "کڑا" سے مال و دولت اور ہیرے جواہرات لٹاتا ہوا جب دہلی پہونچا تو تمام امرائے سلطنت نے اس کا استقبال کیا چنانچہ رکن الدین اور اس کی ماں نے ملتان جاکر پناہ لی اور علاء الدین ہندوستان کا بادشاہ بن بیٹھا۔

علاءالدین خلجی اور ملک کافور

جب سلطان جلال الدین خلجی کو دھوکے سے قتل کر کے علاءالدین دہلی میں داخل ہوا تو امرائے سلطنت نے بادشاہ مرحوم کے احسانات کو فراموش کر دیا، اور علاءالدین کے غیر معمولی داد و دہش کی خبر سن کر سب کے سب لالچ میں آ گئے، اور اُس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اس کے بادشاہ ہونے سے پہلے ہی اس کے گن گانے لگے چنانچہ امیر خسرو بھی دیگر امرا کی طرح ہوا کے رخ کے ساتھ ہو گئے اور بقول پروفیسر وحید مرزا :

"۔ ۔ ۔ قرائن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علاءالدین ابھی بادشاہ ہوا بھی نہ تھا کہ انھوں نے اس کی مدح سرائی شروع کر دی تھی۔ اسی بے رنگ مثنوی میں علاءالدین خلجی کو خطاب کرتے ہیں :

نہ من بودم ز جمع دریافشان
جلوس ترا ادین درفشان؟
مبارک زبانی من بین کہ بخت
بدرگاہ دہلی ترا داد تخت (۱)

امیر خسرو کی تصانیف خصوصاً ان کی مثنویوں کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کی سلطنت کے تخت پر اب سے پہلے جتنے بھی سلطان بادشاہ بیٹھے، ان سب سے زیادہ بہادر، دلیر اور جنگجو، انتظامِ حکومت میں ماہر، رعایا کی خوشحالی کا خیال رکھنے والا، علما و فضلا اور شعرا و ادبا کا قدردان، فتوحات کا خواہشمند اور حدودِ سلطنت کو وسیع کرنے کا شایق، عدل و انصاف کا علمبردار اور اعتدال پسند بادشاہ صرف علاءالدین ہی ہوا تھا۔ چنانچہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں :

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سلطان علاءالدین نے اگرچہ دغا اور بے رحمی سے تخت حاصل کیا تھا اور اگرچہ سخت دلی اور سفاکی اس کی طبیعت کا جوہر خاص تھا پھر بھی عزم و استقلال اور شوکت و شان کا زمانہ گذر رہا ہے۔ تب اگر فتوحات اور انتظامی کارناموں کو چھوڑ کر

(۱) امیر خسرو (ص ۱۲۰ - ۱۱۹)

علمی فیاضیاں بھی کچھ کم حیرت خیز نہیں، اس کا دربار فقرا، علما، فضلا، شعرا سے ہر وقت معمور رہتا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن امیر خسرو کے آفتاب کمال نے ان تمام ستاروں کو بے نور کر دیا تھا (۱)

علاءالدین بھی سکندر اعظم کی طرح جہانگیری کا تو ق رکھتا تھا اور اسی لیے اس نے اپنا لقب بھی "سکندر ثانی" اختیار کیا، لیکن اس کے لایق و فایق اور سمجھدار مشیروں اور وزیروں نے اسے اس بے بنیاد ارادے کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش سے باز رکھا اور مغلوں کے حملوں کی روک تھام کی طرف توجہ دلائی۔ علاءالدین کے عہد حکومت میں یکے بعد دیگرے مغلوں کے پانچ زبردست اور خوفناک حملے ہندوستان پر ہوئے اور شاہی فوج نے نہ صرف انھیں شکست فاش دی، بلکہ سیکڑوں مغلوں کو گرفتار کر کے دہلی لایا گیا۔ جن میں سے بعض ہاتھی کے پاؤں تلے روندے گیے اور بعض فصیلوں پر لٹکا دیے گیے۔ یک مرتبہ خود بادشاہ بھی مغلوں سے مقابلے کے لیے نکلا تھا جس میں اسے فتح حاصل ہوئی تھی۔ ہندوستان پر مغلوں کا پانچواں حملہ، آخری حملہ تھا، کیونکہ اس کے بعد پھر ان کی ہمت نہ ہوئی کہ علاءالدین کے عہد حکومت میں کبھی ہندوستان پر حملہ آور ہوں۔

علاءالدین نے مغلوں کی روک تھام اور سرحدی علاقوں کو مضبوط و مستحکم بنانے کے بعد ہندوستان کے دور دراز علاقوں کو اپنے زیر نگیں لانے کی طرف توجہ دی، کیونکہ وہاں کے حکمرانوں کے پاس بے پناہ دولت اور ہیرے جواہرات تھے اور وہ کوئی فوجی تیاری کے بغیر ہی بڑے اطمینان و سکون سے رہ رہے تھے۔ چنانچہ اس نے سب سے پہلے الوغ خاں اور نصرت خاں کو "گجرات" کی مہم پر روانہ کیا، جہاں سے بے شمار مال غنیمت ہاتھ آیا، اور اس کے بعد یکے بعد دیگرے رنتھنبور، نہروالہ، چتوڑ اور دیوگیر پر شاہی لشکر نے حملہ کر کے یا تو ان کو شکست دے دی یا انھیں اپنا باجگزار بنا لیا۔

رنتھنبور کی کامیابی کے بعد علاءالدین نے خود ہی چتوڑ کی تسخیر کا ارادہ کیا، جب وہ دہلی

---

(۱) شعرالعجم دوسری جلد (ص ۱۲۰ ۔ ۱۱۹)

سے روانہ ہوا تو امیر خسرو بھی اس کے ہمراہ تھے۔ چونکہ چتوڑ کا قلعہ بے حد مضبوط تھا اور آسانی سے مسخر نہیں کیا جا سکتا تھا، اس لیے شاہی فوج نے قلعے کا محاصرہ کر لیا، قلعے کے محاصرے کے دوران ہی برسات آگئی جس سے سارا لشکر پریشانی میں مبتلا ہو گیا، لیکن علاؤالدین ایسے جلال و جبروت کا حکمراں تھا کہ کسی کو لب کشائی کی بھی ہمت نہ ہوئی، امیر خسرو نے "خزائن الفتوح" میں اپنی پریشانی اور گھبراہٹ کا بیان ان الفاظ میں کیا ہے:

"میں جو اس سلیمان کا ہدہد ہوں ساتھ تھا، اور اگرچہ لوگوں نے مجھے کئی بار کہا کہ میں دہلی واپس چلا جاؤں، میں برابر وہیں رہا، اسی لیے کہ مجھے اپنے آقا کی ناراضگی کا ڈر تھا،
کیونکہ وہ کہیں پوچھ بیٹھتا کہ کیا بات ہے مجھے اپنا ہدہد نظر نہیں آتا؟ کیا وہ کہیں چل دیا ہے؟
تو مجھے خطرہ تھا کہ مجھ سے کوئی معقول جواب نہ بن پڑے گا اور بادشاہ کے حکم کی کہ
"اسے کوئی بین وجہ اس غیر حاضری کی پیش کرنی چاہیے" میں تعمیل سے قاصر ہونگا۔"[1]

جب سلطان علاؤالدین بہت حد تک اپنی ملک گیری کے شوق کو پورا کر چکا تو اس نے ملک میں امن و امان قائم رکھنے کی طرف اپنی توجہ مبذول کی اور اپنے وزیروں اور مشیروں سے بات چیت کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہونچا کہ سلطنت میں ساری خرابیاں اور بدعنوانیاں دولت اور شراب کی کثرت سے ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس نے سب سے پہلے خود شراب چھوڑی اور اس کے بعد شراب بندی کا عام حکم دیا، جہاں جہاں شراب کے ذخیرے ملے وہاں وہاں چھاپہ مار کر ضبط کر لیا گیا اور بازاروں اور گلیوں میں لنڈھا دیا گیا، بادشاہ نے بڑے بڑے تاجروں اور سوداگروں سے دولت چھین کر غریبوں میں تقسیم کرانا، بنا اصول بنا لیا اور اس کام کو کرنے کے لیے ہر چیز کی قیمت مقرر کر دی، جو تاجر مقررہ نرخ سے زیادہ قیمت لیتے ہوئے یا وزن میں کم تولتا ہوا پکڑا جاتا، اسے سخت سزائیں دی جاتی تھیں جس کے نتیجے میں ملک سے چور بازاری، ذخیرہ اندوزی اور غریبوں کے استحصال کا خاتمہ ہو گیا۔

بادشاہ کو یہ خیال ہوا کہ سلطنت میں امن و امان اور خوشحالی کے لیے اخلاق کی درستگی،

---

(۱) امیر خسرو (ص ۱۳۰ - ۱۲۹) مولفہ وحید مرزا۔

مذہبی عقاید کی استواری اور معاشرتی حالات کی اصلاح بھی ضروری ہے، کیونکہ یہی وہ بنیادی باتیں ہیں جن کی وجہ سے رعایا کا کردار خراب ہو جاتا ہے، پستی اور گراوٹ پیدا ہوتی ہے اور نت نئے فتنے اٹھتے رہتے ہیں، چنانچہ اس نے ہندوستان کے بعض حصوں میں آباد فرقہ اسماعیلیہ کے لوگوں کا قلع قمع کیا اور اس کے ساتھ ہی کھلے عام ہونے والی عیاشیوں کی بھی روک تھام کی۔ بادشاہ کی ان اصلاحات کا ذکر کرتے ہوئے امیر خسرو لکھتے ہیں :

"زنان بازاری جو اپنی حلقہ صفت زلفوں کا جال ادھر ادھر پھیلاتی پھرتی تھیں اور شہر میں جہاں جی چاہا اکیلی گیلی پڑی پھرتی تھیں، مجبور کی گئیں کہ گھروں کی چہار دیواری میں بیٹھیں، اور اب افسوس اور ندامت کے باعث وہ اپنے ہاتھ مل مل کر اپنے نقاب کے تار چنتی ہیں (۱) "

شمالی ہندوستان میں سلطنت کی بنیادیں مضبوط اور مستحکم بن جانے کے بعد بادشاہ نے جنوبی ہندوستان کی طرف توجہ کی، اور دیوگیر، سیوانہ، وارنگل، ارم کنڈا، معبر اور دھور سمندر وغیرہ کے راجاؤں کو شکست دیتا ہوا جنوبی ہند کے سواحل سمندر تک اس نے اپنی فتوحات کا پھریرا لہرادیا۔ یہ زمانہ بادشاہ کے نقطۂ عروج اور کمالِ قوت کا زمانہ تھا، اس کی سلطنت کی سرحدیں ایک طرف "اڑیسہ" سے "گجرات" اور سندھ تک اور دوسری طرف "پنجاب" سے راس کماری تک پھیلی ہوئی تھیں اور اتنے بڑے وسیع و عریض ملک میں بھی اس نے امن و امان، فارغ البالی اور عدل و انصاف قایم کر رکھا تھا، چنانچہ برنی نے لکھا ہے :

" علاءالدین کے عہد کی پہلی تعجب خیز بات یہ تھی کہ اناج، کپڑا اور ہر قسم کی ضروریات زندگی بہت ارزاں تھیں اور ان کی قیمتوں میں قحط اور خشک سالی کے باوجود بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا، جب تک علاءالدین زندہ رہا یہ ارزانی برابر قایم رہی (۲) "

---

(۱) "امیر خسرو" مولفۂ وحید مرزا (ص ۱۴۲ - ۱۴۱)

(۲) "امیر خسرو" مولفۂ وحید مرزا (ص ۱۴۰) .

امیر خسرو لکھتے ہیں :

"کیا عجب امن و امان کا زمانہ ہے کہ ..... انصاف اور رعایا کی بہبود کے لیے اس نے ایسے قواعد اور آئین قایم کر دیے ہیں کہ جن کی صورت نہ جو تو آئینہ اسکندری میں نظر آسکتی ہیں، ورنہ جام جمشید میں دکھائی دیتی ہیں، رتی صاحب رایے سے اس نے تاج کے سستا کرنے کے لیے، جو سرمایۂ زندگی کا خمیر ہے، ایک ایسا قانون بنا دیا کہ اگر آسمان تک بھروں اپنی پیشانی کا پسینہ نہ ٹپکائے، جو اپنا پنکھا ہلا دے، زمین سرخ سبزہ نہ پیدا کرے، اور گرم سورج فصلوں کو نہ پکائے تو وہ عام رعایا کو اپنے غلے کے ذخیروں سے کھانا مہیا کر سکتا ہے۔ لوگوں کی ضرورتیں بھی، خواہ وہ کبریت احمر بالکل سفید ہی کیوں نہ ہوں، ایسی ارزاں ہیں اور ایسی آسانی سے دستیاب ہو سکتی ہیں، جیسے زرد عنبر یا سرخ اناج ..... (۱)"

علاء الدین کی تخت نشینی کا زمانہ، وہ زمانہ تھا کہ ہر چہار طرف خفیہ سازشوں کا خوفناک اور تباہ کن جال بچھا ہوا تھا، اقتدار کی کش مکش اور جنگ عام تھی سرکشی اور سرکوبی کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا اور ایک دوسرے کو زہر دے کر مار دینا یا مروا دینا صرف ایک کھیل تھی۔ سیاسی تاریخ دن واقعتی تیزی سے رونما ہوتا تھا کہ کسی کے اقتدار کا کوئی بھروسہ نہ تھا کہ کب تک رہے گا اور کب ختم ہو جائے۔ یہی وجہ کہ اقتدار کی تبدیلی کے وقت امرا بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے اور بہت سوچ سمجھ کر کسی سے اپنا تعلق توڑتے اور جوڑتے تھے۔ امیر خسرو بھی ایک امیر تھے اور امارت کی سیاسی چالیں بھی انھوں نے اپنے باپ دادا سے ورثے میں پائی تھیں۔ چنانچہ ان کی زندگی کے حالات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حکمرانوں کے مزاج شناس اور ان کی نفسیات کے ماہر تھے۔ دہلی کے بدلتے ہوئے حالات اور سیاسی نشیب و فراز کی نبض پر ان کی مزاج شناس انگلیوں کی گرفت اتنی سخت تھی کہ کیقباد کے قتل کے قبل ہی وہ جلال الدین کے اعصاب پر چھا گئے تھے اور اب علاء الدین کے مزاج میں بھی دخیل ہو گئے۔ سلطان علاء الدین خلجی اپنی گوناگوں صلاحیتوں اور خوبیوں کے سبب امیر خسرو کا ہیرو بن گیا تھا اور اس کی پرکشش اور بارعب شخصیت بھی ان کے لیے

(۱) امیر خسرو مولفہ وحید مرزا ص ۱۲۹، ۱۳۰

مثالی بن گئی تھی۔ اس بادشاہ کی حکومت کا عہد امیر خسرو کے لیے زریں دور تھا کیونکہ اسی زمانے میں انھوں نے ایسی نغمہ سرائی کی کہ فارسی کے بڑے بڑے شاعروں کو پیچھے چھوڑ گیے، لیکن اس کے باوجود امیر خسرو کے کلام کے مطالعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس بادشاہ کے زمانے میں زیادہ خوش نہ رہ سکے۔

علاءالدین خلجی سے قبل تمام امیروں، شہزادوں کیقباد اور جلال الدین نے امیر خسرو کا خیر مقدم کیا تھا اور اپنے دربار سے ان کی وابستگی پر نازاں تھے۔ وہاں تک کہ ان کے فرائض میں اس کے سوا کوئی کام نہ تھا کہ وہ اپنے آقا کی مدح سرائی کریں اور محل میں ہونے والی محفلوں اور مجلسوں میں شریک ہو کر اپنی مترنم ادا اور شاعری سے رونق فراہم کریں۔ کیقباد کے دربار میں ان کا کام صرف اس کی مدح سرائی کرنا تھا اور اگرچہ جلال الدین وہ پہلا بادشاہ تھا جس نے نہ صرف انھیں مصحف داری کا عہدہ دیا بلکہ امارت سے بھی سرفراز کیا، اس کے باوجود صرف اس کی مدح سرائی کرنا اور اس کی مجلسِ عیش کے لیے روزانہ غزل لکھنا ہی ان کا فرضِ منصبی تھا۔ اور اسی کام کے لیے ان کو بے شمار روپیہ پیسہ، سونا چاندی اور ہیرے جواہرات بطور انعام ملتے جاتے تھے۔ لیکن امیر خسرو کے سابق روایتوں کی روایات کے خلاف علاءالدین ان سے ایسے سخت کام لیتا تھا جن کے وہ عادی نہ تھے، اور ان کو جو صلہ ملتا تھا وہ یک ہزار تنکہ سالانہ کی تنخواہ تھی۔ جس سے ان کی گذر اوقات بھی بہت مشکل سے ہوتی تھی۔ اس بادشاہ نے ان کا عہدہ بھی وہی مصحف داری کا رکھا جس پر وہ پہلے سے فائز تھے، اس لیے وہ اس کو ایک مثالی شخصیت تصور کرنے کے باوجود اس کی بخل اور قدردانی کی وجہ سے کچھ کچھ بیزار رہا کرتے تھے۔

امیر خسرو کے کلام سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تخت نشینی کے بعد کچھ عرصے تک خوب جی بھر کے دادِ عیش دے لینے کے بعد جب علاءالدین خلجی نے انتظامِ حکومت کی طرف باقاعدہ توجہ مبذول کی تو اس کی طبیعت میں اعتدال روی آ گئی تھی اور باوجودیکہ اس کا دربار عالموں، فاضلوں، شاعروں اور ادیبوں سے بھرا رہتا تھا، وہ بہت کم انعام و اکرام دیتا تھا۔ بلکہ سب کے سب صرف اپنی تنخواہ ہی پر گذر اوقات کرتے تھے۔ دلی کے

تخت پر قبضہ جمانے کے لئے بیشک اس نے کڑا سے دہلی تک راستے بھر دولت لٹائی تھی، لیکن بادشاہ ہو جانے کے بعد اس نے بے سبب دریا دلی اور سخاوت کو فضول خرچی سمجھکر بند کر دیا، اور اس کی وجہ سے امرا بھی تنگ دست رہنے لگے۔ بادشاہ کے اس بخل سے خواہ امرا کو کیسی ہی تکلیف اور تنگ دستی کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑا ہو، لیکن اتنی بات ضرور ہوئی کہ سارے ملک میں خوشحالی کی فضا پیدا ہوگئی تھی، اور غریبوں کی ضروریات زندگی بھی مہیا ہو جایا کرتی تھیں، کیونکہ ملک کی دولت پر مٹھی بھر افراد ہی کا قبضہ نہ تھا بلکہ تمام رعایا کو ان کے حقوق برابر ملتے تھے۔ بادشاہ کی سخت گیری کی وجہ سے امیر خسرو کو وہ قدر دانی نصیب نہ ہو سکی جو پہلے ہوا کرتی تھی، چنانچہ انھوں نے ایک بار نہیں متعدد مرتبہ، کبھی ڈھکے چھپے الفاظ میں اور کبھی کھل کر اپنی طرف بادشاہ کی توجہ مبذول کرانی چاہی ہے، چنانچہ وہ اپنی ایک مثنوی "عرض حال" میں کہتے ہیں:

"...... اے بادشاہ! میں جانتا ہوں کہ آپ ایسا عقلمند کوئی بادشاہ نہیں ہوا، اس لیے کہ آپ ہنر کے پورے قدر شناس، اشعار کے قابل نقاد اور شاعری کے دوست اور مددگار ہیں، لیکن افسوس! مجھ پر ایسا برا وقت پڑا ہے کہ ڈھنگ سے کسب معاش بھی نہیں کر سکتا، اگر آپ کے وقت میں بھی میری حالت نہ سدھری تو پھر کب سدھرے گی؟ کیسے افسوس کی بات ہے کہ آپ جیسا بادشاہ ہو اور مجھ جیسا شاعر ایسی تنگی میں گذارن کرے، جو وظیفہ مجھے آپ سے ملتا ہے وہ میرا حق ہے اور میری خدمت کا صلہ ہے، اس لیے کہ میں ہمیشہ رکاب شاہی کے ہمراہ رہتا ہوں...... لیکن دل میں آپ کی تمنا توانی کی خواہش ہے، بغیر صلہ کے یہ خواہش کیونکر پوری ہو سکتی ہے؟ آپ اس بخشش و کرم سے واقف نہیں جو پچھلے بادشاہ شاعروں پر کیا کرتے تھے، جو بعض دفعہ ایک قصیدے کے صلہ میں ایک خزانہ بخش دیتے تھے..... (۱)

(۱) امیر خسرو مولفہ وحید مرزا (ص ۱۲۵ - ۱۲۲)

امیر خسرو ایک اور جگہ بادشاہ کی سخاوت کو للکارتے ہوئے کہتے ہیں:

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک روز آپ نے مجھ پر مہربان ہو کر فرمایا تھا کہ اے ہمارے عہد کے ثناخواں، خوش ہو کہ تجھے ہماری حکومت سے بلندی نصیب ہوئی اور تو ہمارا مقرب بنا، ہم تجھے اتنا مال و دولت دیں گے کہ تو ہزانہ لینے اور فکر سے بے نیاز ہو جائے گا۔ اسی وعدہ سے یہ کمترین خادم اب تک خانع رہا، لیکن اس بات کو چار سال گذر گئے، حضور کا اقبال سیکڑوں برس قائم رہے، اسی خیال سے یہ یاد دہانی کرتا ہوں کہ آپ جیسا شخص جو وعدہ کرے وہ ضرور پورا ہوگا۔ آپ کے لطف و کرم سے ہزاروں غلام مرتبے میں آسمان کو پہنچ گئے، انھیں خوش قسمت غلاموں میں سے ایک مجھے بھی بنا دیجئے" (۱)

ایسا لگتا ہے کہ امیر خسرو کو رات دن دربار میں حاضری دینی پڑتی تھی جس کے وہ عادی نہیں تھے اور نہ ہی پہلے کسی بادشاہ نے ان سے اس قسم کا کام لیا تھا۔ دربار میں مسلسل حاضری دیتے رہنے کی وجہ سے ان کی تخلیقی قوت کو روز بروز زنگ لگتا جا رہا تھا اور وہ اتنی فرصت نہیں پاتے تھے کہ اپنے خیالات و احساسات و جذبات کو شعر کا پیکر پہنا سکیں، اسی لیے انھوں نے متعدد مرتبہ مختلف انداز سے بادشاہ سے اس فرض سے بری کر دیے جانے کی درخواست کی، ایک جگہ کہتے ہیں:

" اگر دن رات میں جہاں پناہ کے دربار میں اپنی حقیر خدمات انجام دینے کے لیے حاضر نہ رہ سکوں تو اس سے کیا ہرج ہے؟ اس لیے کہ جب سوتا جدار سر آپ کے سامنے روز جھکتے ہوں تو آپ ایک گدا کی غیر حاضری کو آسانی سے معاف کر سکتے ہیں۔ میں اس لیے نہیں کہتا کہ میں آپ کی خدمت نہیں کر سکتا، بلکہ میں تو آپ کی خدمت میں دن اور رات، صبح اور شام موجود رہ سکتا ہوں، مجلس میں اپنے کلام کی جادوگری دکھا سکتا ہوں اور لڑائی کے وقت تلواروں سے کھیل سکتا ہوں، بلکہ اگر چاند سے تیروں اور نیزوں کی بارش ہو رہی ہو تو بھی میں آپ کی رکاب مبارک کو چھوڑ کر نہ جاؤں گا، لیکن مجھے موتی پرونا ہیں، اور

(۱) امیر خسرو مولفہ وحید مرزا (ص ۱۵۰ - ۱۴۹)

دقیق باتوں کو تازگئی خیال کے ساتھ ادا کرتا ہے، کبھی تو کسی چشمۂ رواں کا رُخ کرتا ہوں اور کبھی کسی سرسبز مرغزار کی طرف جاتا ہوں اور آپ کے گوشِ مبارک کے شایان کوئی موتی حاصل کرنے سے میرا خون سمندر کی طرح ابلتا ہے، گو وہ موتی آپ کے قابل نہ ہو تو بھی آپ کے علوم کے کان کے ریت ہوتا ہے، اور میں آپ کے حلقۂ خدمت سے اسی لیے دور رہنا چاہتا ہوں کہ کہیں میرا موتی لوگوں کے انبوہ میں گم نہ ہو جائے، اگر میں دن رات آپ کی خدمت میں کھڑا رہوں تو میرے دماغ سے کیا شاعری ہو سکتی ہے؟ بغیر غور و فکر کے یقیناً میرے کلام میں گہرائی ہوگی اور نہ متانت (۱)"

امیر خسرو ایک جگہ اپنی کیفیت یوں بیان کرتے ہیں:

"لیکن میں بیچارہ ضرورت مند اور بے ہوش و حواس رہتا ہوں اور فکر سے میرا خون دیگ کی طرح کھولتا رہتا ہے، رات سے صبح تک اور صبح سے شام تک مجھے گوشۂ غم میں آرام کرنے کی مہلت نہیں ملتی، اپنے اس مرکشِ نفس کی وجہ سے اپنے جیسے ایک انسان کے سامنے کھڑا رہتا ہوں اور جب تک سر سے پاؤں تک پسینے میں نہ بھیگ جاؤں میرا بالا کسی کے پانی سے تر نہیں ہوتا (یعنی کوئی مجھے کھانا نہیں کھلاتا) ۔ جو مزدوری مجھے ملتی ہے اسے لوگ اپنا احسان سمجھتے ہیں۔ اور جو محنت میں کرتا ہوں وہ سب بیکار محض سمجھی جاتی ہے، میرا حال اس گدھے کی طرح ہے جو اتنی مشقت اور رنج سے چارہ ادا کرتا ہے اور اسے تھوڑے سے جو کھانے دیے جاتے ہیں لیکن وہ بھی بہت ذلت کے ساتھ ..... (۲)

امیر خسرو کے کلام کے مطالعے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہی وہ زمانہ ہے جب ان کے خیالات میں تبدیلی رونما ہونے لگی تھی اور وہ دنیاوی معاملات، دربادی

---

(۱) "امیر خسرو" مولفۂ وحید مرزا (ص ۱۵۰-۱۴۹) (۲) امیر خسرو مولفۂ وحید مرزا (ص ۱۵۱)

زندگی اور خوشامدانہ روش سے کتراتے لگے تھے۔ درباری زندگی کی غیر معمولی مصروفیات اور انا کی تذلیل نے نہ صرف انہیں شاعرانہ اور تخلیقی قوتوں کے صحیح استعمال سے روکا بلکہ خود وہ اپنی آنکھوں میں بھی ذلیل ہونے لگے تھے۔ لیکن اس کے باوجود زندگی کی آخری سانس تک انھوں نے دربار سے وابستگی ختم نہیں کی اور علاءالدین خلجی کے بعد بھی ہر بادشاہ کی ملازمت میں رہے۔ البتہ جو فرق ان کی شخصیت میں آیا تھا، وہ یہ تھا کہ علاءالدین کے عہد حکومت میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیا سے ان کا روحانی تعلق قائم ہوا اور یہی تعلق ان کی بقیہ اور آئندہ زندگی کے لیے بہت بڑا سہارا بن گیا تھا۔ جب صبح سے شام تک دربار میں حاضری دیتے دیتے وہ تھک کر نڈھال ہو جاتے اور خوشامد اور چاپلوسی سے دل و دماغ پراگندہ ہو جاتے تو اپنے مرشد کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے جہاں انکی ساری تکان دور ہو جاتی اور دل و دماغ کو یک گونہ سکون و اطمینان میسر آجاتا تھا۔

ادھر امیر خسرو کا جی دنیا کی رعنائیوں اور زیبائیوں سے اچاٹ رہا تھا اور ادھر سلطان علاءالدین خلجی اپنی زندگی کی آخری سانسیں گن رہا تھا۔ ایسا ہیبت و جلال والا بادشاہ جب بیمار پڑا تو اس بڑھاپے میں اس کے خاندان والوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی اور وہ اپنے غلام اور فوجی جنرل ملک کافور کے رحم و کرم پر پڑا رہا۔ بادشاہ کے بھائی اور دست راست الماس بیگ الغ خان کا انتقال پہلے ہی ہو چکا تھا اور اس کے بعد ملک کافور نے خضر خاں کو بھی ولیعہدی سے برطرف کرا کے اسے گوالیار بھیج دیا۔ اس کے گوالیار پہنچتے ہی امیر خسرو کے بیان کے مطابق ملک کافور نے بادشاہ کو زہر دے کر مار دیا اور خضر خاں کے خرد سال بھائی شہاب الدین کو تخت پر بٹھا کر خود سلطنت کا مالک بن گیا اور ایسی بدعنوانیاں برپا کیں کہ کوئی تصور نہیں کر سکتا۔ ملک کافور نے خضر خاں کو گوالیار میں اندھا کر کے قید کر دیا اور اس کے دو بھائیوں شادی خاں اور فرید خاں کے ساتھ بھی یہی برتاؤ کیا۔ ان سب کے ختم ہو جانے کے بعد خرد سال بادشاہ شہاب الدین کے علاوہ ایک اور بھائی مبارک شاہ ابھی بچ رہا تھا۔ وہ اس کا بھی یہی حشر ہونے والا تھا کہ ملک کافور کے اپنے ہی خاص مقربین نے اسے ہزار ستون کے محل میں قتل کر دیا اور اس طرح اس ظالم و جابر جنرل کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

۞

قطب الدین خلجی اور خسرو خاں

ملک کافور کے قتل کے بعد جب علاءالدین خلجی کا بیٹا مبارک شاہ، قطب الدین کا لقب اختیار کر کے دہلی کی سلطنت کا بادشاہ ہوا تو ملک بھر میں اطمینان و سکون کی سانس لی گئی، کیونکہ علاءالدین کی سخت گیری اور اس کے بعد ملک کافور کے تشدد سے امرائے سلطنت اور عوام دونوں پریشان ہو چکے تھے۔ قطب الدین مبارک شاہ ایک نوجوان حکمراں تھا جو انتہائی خوش مزاجی اور رنگین طبیعت کا مالک تھا۔ اس کے دور حکومت میں اگرچہ قانونی طور پر عام عیاشی، اور شراب نوشی پر پابندی لگی رہی، مگر چونکہ وہ خود شراب پیتا تھا اور داد عیش دیتا تھا اس لیے اس کی مثال سامنے رکھکر امرا بھی چھپ چھپا کر اپنا شوق پورا کر لیا کرتے تھے۔

مبارک شاہ اپنی عیاشیوں کے باوجود اپنے باپ کی کچھ جنگجویانہ صفات رکھتا تھا، چنانچہ اس نے بھی ایک شاہی لشکر کے ساتھ جنوبی ہند کا رخ کیا اور سب سے پہلے "دیوگیر" پر حملہ کر کے اپنا قبضہ جما لیا۔ اس مہم میں خسرو بھی بادشاہ کے ساتھ تھے، کیونکہ علاءالدین خلجی کے ایک معتبر اور وفادار امیر کی حیثیت سے مبارک شاہ ان پر کافی اعتماد کرتا تھا، اسی لیے اس کے دربار میں بھی وہ سابق بادشاہوں کی طرح قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ دیوگیر پر بادشاہ کی فتحیابی کے سلسلے میں انھوں نے ایک قصیدہ بھی لکھا تھا۔

بادشاہ نے گجرات کی قوم "پرواز" سے متعلق ایک نومسلم خسرو خاں کو اپنا مقرب بنایا تھا، اس پر بادشاہ کے اعتماد کی یہ حالت تھی کہ مبارک شاہ نے اسے دیوگیر سے فوج دے کر "تلنگ" کی طرف روانہ کیا، اور اس نے "وارنگل" کا محاصرہ کر لیا، وہاں کے راجہ نے مجبوراً گراں بیش قیمت تحایف اور بیش دکھ چھ سو سالانہ خراج دینا منظور کر کے مصالحت کر لی اور خسرو خاں سب مال غنیمت لیکر دیوگیر واپس آ گیا۔ اس کے بعد بڑے تزک و احتشام کے ساتھ شاہی لشکر دہلی لوٹ آیا، لیکن اس کے بعد پھر رنگ رلیاں منانے کے سوا اسے کوئی کام نہ رہا تھا۔

دیوگیر اور ورنگل کی فتح کے باعث اس کے مزاج میں بہت زیادہ رعونت آگئی تھی اور دین سے بیگانہ ہوگیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے "خلیفہ رب العلمین" ہونے کا دعویٰ کیا اور ایک سازش کے تحت اس نے خضر خاں اور دوسرے بھائیوں کو بھی قتل کرا دیا تھا۔ اس کی بدچلنی کا تذکرہ کرتے ہوئے ضیاء الدین برنی کے حوالے سے پروفیسر وحید مرزا لکھتے ہیں :

"مذہب سے بالکل لاپرواہی برتنے لگا اور دربار میں بھانڈوں اور بازاری عورتوں کا راج ہوگیا۔ خود زنانے کپڑے پہن کر دربار میں چلا آتا تھا اور ہزار ستون کی چھت سے رنڈیاں اور ڈومنیاں بڑے بڑے ملکوں اور امیروں کو گالیاں سنایا کرتی تھیں (۱)"

ایک تو حضرت نظام الدین اولیا سے خضر خاں کو ارادت تھی، دوسرے یہ کہ وہ اس کی ناشائستہ حرکتوں پر سخت نکتہ چینی کرتے تھے، اسی لیے وہ ان سے مخاصمت برتا۔ وہ ہوگیا اور ان کی اہمیت کم کرنے کے لیے ملتان سے شیخ رکن الدین کو دہلی بلا کر رکھا اور اکثر نشے کی حالت میں کہا کرتا تھا کہ جو شخص حضرت نظام الدین کا سر کاٹ کر لائے گا اسے ایک ہزار سونے کے تنکے انعام میں دیے جائیں گے ۔

ایک روایت کے مطابق مبارک شاہ نے حضرت نظام الدین اولیا کو حکم دیا کہ وہ بھی علما و صوفیا کی طرح اس کے دربار میں حاضری دیا کریں، مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا، آخر کار بادشاہ نے جمادی الاول کے مہینے میں انھیں دھمکی دی کہ اگر وہ اس مہینے کے آخر تک دربار میں حاضر نہ ہوئے تو ان کی "غیاث پور" کی خانقاہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی۔ حضرت کے مریدوں نے انھیں بہت سمجھایا بجھایا کہ وہ بادشاہ کا حکم مان لیں لیکن وہ مسلسل انکار کرتے رہے اور بالآخر وہ آخری دن ختم ہونے سے پہلے ہی مبارک شاہ، خسرو خاں کے ہاتھوں قتل کر دیا گیا۔

امیر خسرو کے لیے مبارک شاہ کا عہد حکومت انتہائی صبر آزما کشتوں کا دور تھا، کیونکہ وہ ایک طرف بادشاہ کے امیر اور درباری تھے تو دوسری طرف حضرت نظام الدین اولیا

---

(۱) امیر خسرو (ص ۱۵۵)

کے قدموں میں اپنی متاعِ جان و دل کا نذرانہ بھی پیش کر چکے تھے۔ اس کے باوجود بادشاہ ان پر بہت مہربان تھا، اور اس کی فرمائش پر انھوں نے ایک مشہور مثنوی "نہ سپہر" بھی لکھی جو بعض وجوہ سے ان کی تمام مثنویوں میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

امیر خسرو جو علاؤالدین خلجی کی سخت گیری اور بحالت باکفایت شعاری کی وجہ سے تنگ آچکے تھے، مبارک شاہ کے زمانے میں انھوں نے اتنا انعام و اکرام اور اتنی دولت پائی کہ نہال ہو گیے، چنانچہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

"۔ ۔ ۔ ۔ قطب الدین مبارک شاہ جو علاؤالدین خلجی بادشاہ ہوا، وہ اگرچہ نہایت عیاش، بے مغز اور سبک سر تھا، لیکن امیر کی قدر دانی سب سے بڑھ کر کی، چنانچہ امیر نے جب ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے نام پر مثنوی نہ سپہر لکھی تو ہاتھی برابر تول کر روپیے دیے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (۱)"

چونکہ بعض روایات کے مطابق مبارک شاہ نے یہ وعدہ کیا تھا کہ جو اس کے عہد حکومت کی داستان نظم کرے گا، اسے ہاتھی برابر تول کر سونا دیا جایے گا۔ امیر خسرو کو نہ سپہر کی تصنیف پر ہاتھی برابر سونا یا روپیہ ملا یا نہیں، اس کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے، لیکن امیر خسرو کے مندرجہ ذیل شعر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں خاطر خواہ صلہ ضرور ملا تھا:

چنین بخششی کز توجم یافتم
ز شاہان پیشینہ کم یافتم (۲)

قطب الدین مبارک شاہ نے خسرو خاں کو اپنا ندیم خاص بنا کر اسے قلمدانِ وزارت سونپ دیا تھا، وہ اپنے عہدے کی اہمیت اور بادشاہ کی سلطنت کی طرف سے بے پرواہی کی وجہ سے دہلی کا اصلی حکمراں بن بیٹھا تھا۔ حکومت کے بڑے اور اہم ترین عہدوں پر اس نے اپنی قوم کے لوگوں کو مامور کر کے سلطنت پر اپنا معنوی قبضہ جما لیا

(۱) شعر العجم دوسری جلد (ص ۱۲۱)

(۲) امیر خسرو (ص ۱۷۳)

تھا اور بادشاہ کو ختم کرنے کے لیے برابر موقع کی تلاش میں رہتا تھا۔ ایک رات کو "ہزار ستون" محل میں بادشاہ خسرو خاں سے تخلیے میں تبادلۂ خیال کر رہا تھا کہ خسرو خاں کے آدمی دندناتے ہوئے داخل ہو گئے۔ چونکہ حملہ آوروں نے منظم سازش کے تحت پہلے ہی محل کے دربانوں اور محافظ دستے کو قابو میں کر لیا تھا۔ اس لیے کسی قسم کی مزاحمت یا مدافعت کا سامنا بھی انھیں نہ کرنا پڑا۔ بادشاہ نے بھاگ کر حرم میں چھپ جانا چاہا لیکن خسرو خاں نے اس کے بڑے بڑے بالوں کو پکڑ لیا اور بالآخر مبارک شاہ کا سر کاٹ کر محل کی بالائی منزل سے نیچے پھینک دیا گیا۔

خسرو خاں نے بڑی آسانی سے محل پر قبضہ جما کر بڑے بڑے امرائے سلطنت کو گرفتار کر لیا، اور انھیں بزور طاقت مجبور کیا کہ اسے بادشاہ تسلیم کریں، چنانچہ وہ بادشاہ تسلیم کر لیا گیا، اس کی حکومت اگرچہ چند روزہ تھی لیکن اس مختصر سی مدت میں اس نے حرم شاہی کی بے حرمتی کی، امرا پر مظالم ڈھائے، قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا، اور چونکہ وہ نو مسلم تھا اور ابھی تک اپنے پرانے مذہب سے اس کا رشتہ پورے طور پر ختم نہ ہوا تھا، اس لیے اس نے مذہب اسلام کی بھی توہین اور بے حرمتی کی، غرضیکہ اس کے مظالم اپنی انتہا کو پہنچ گئے تھے۔ لیکن کسی امیر میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اس کے خلاف آواز بلند کرتا۔ اسی اثنا میں جونا خاں کسی طرح خسرو خاں کی قید سے نکل بھاگا اور اپنے باپ ملک تغلق (۱) کے پاس "دیپال پور" پہنچ کر اسے دہلی کی ساری داستان سنائی۔ ملک تغلق شاہی خاندان کا بڑا وفادار اور بہت ممتاز سپہ سالار تھا، وہ ان دنوں مغلوں کی روک تھام کے لیے دیپالپور میں متعین تھا۔ ملک تغلق نے جب شاہی خاندان کے قتل اور حرم کی بے حرمتی اور امرا کی ذلت و تذلیل کی داستان سنی تو وہ غصے سے بے قابو ہو گیا، اس نے ایک طرف دہلی پر حملے کی تیاریاں شروع کیں اور دوسری طرف بڑے بڑے صوبہ داروں اور امیروں کو اپنی مدد کرنے کی دعوت دی۔ بعض نے اس کی دعوت قبول کی مگر بعض نے اقتدار پرستی کے

---

(۱) شبلی نعمانی نے "شعر العجم" میں (دوسری جلد ص ۱۲۲) میں ملک تغلق کو "غازی ملک" لکھا ہے۔

سبب اس کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔

خسرو خاں کو جب ملک تغلق کے ارادے کی خبر ملی تو اس نے دہلی کے مشایخ اور امرا کے لیے خزانے کا منہ کھول دیا اور بے پناہ دولت لٹائی۔ ملک تغلق نے اپنی تیاریاں مکمل کر کے جب دہلی کا رخ کیا تو خسرو خاں نے اپنے بھائی کو، جسے اسی نے خان خاناں کا لقب دیا تھا ایک بڑی فوج دیکر مقابلے کے لیے روانہ کیا۔ شاہی فوج "سرستی" تک پہنچ گئی لیکن ملک تغلق نے "دریائے بیاس" کے کنارے پر ہی اسے شکست دیکر پراگندہ کر دیا اور دہلی کی طرف بڑھتا ہی چلا آیا۔ جب وہ دہلی سے کچھ فاصلے پر رہ گیا تو خسرو بھی مقابلے کے لیے نکل پڑا۔ اور حوضِ سلطانی کے پاس "لہراوت" میں گھمسان کی جنگ کے بعد ملک تغلق نے شاہی فوج کو شکستِ فاش دے دی۔ دہلی کی فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ اور خسرو خاں اور اس کا بھائی بھی اپنی جان بچا کر بھاگ نکلے، مگر دوسرے دن وہ دونوں گرفتار کر لیے گئے اور پھر ان کے سر کاٹ کر اسی ہزار ستون محل سے نیچے پھینک دیے گئے، جہاں سے کچھ عرصہ پہلے مبارک شاہ کا سر پھینکا گیا تھا اور اس طرح ملک تغلق دہلی کی سلطنت کا حکمراں بن گیا۔

غیاث الدین تغلق

ملک تغلق کو اگرچہ حکومت سے ذرا بھی دلچسپی نہیں تھی اور اس نے صرف اپنے آقا کے قتل کا انتقام لینے اور شرفا و امرا کو ذلت سے بچانے کے لیے دہلی پر حملہ کیا تھا، مگر چونکہ خلجی خاندان میں سے تخت و تاج کا کوئی وارث زندہ نہیں رہا تھا اور تمام امرائے سلطنت کو اس کی خدمت کا اعتراف تھا۔ اسی لیے امرا نے اس سے دہلی کی سلطنت کے تخت پر مسند نشین ہونے کی درخواست کی جسے بہت کچھ پس و پیش کے بعد اس نے منظور کیا۔ شبلی نعمانی اس کی تخت نشین کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

"اب خلجی حکومت کا خاتمہ ہو گیا، اور امرائے دربار میں سے غازی ملک (ملک تغلق) نے جس کا باپ سلطان غیاث الدین بلبن کا ترکی غلام اور ماں اس کی ہندنی تھی دربار میں پکار کر کہا کہ مجھکو تخت سلطنت کی آرزو نہیں، خاندانِ شاہی سے کسی کو تخت نشین کیا جائے، لیکن چونکہ خلجی خاندان میں سے کوئی شخص باقی نہ رہا تھا اور ملک غازی کی خدمات کا تمام دربار معترف تھا۔ اس لیے اس نے با تفاق اسی کو بادشاہ بنایا، وہ سلطان غیاث الدین تغلق کے نام سے مشہور ہوا اس نے نہایت عدل و انصاف سے حکومت کی اور نئی نئی فتوحات حاصل کیں۔ تغلق آباد کا مشہور قلعہ اسی کی یادگار ہے۔ . ."

غیاث الدین تغلق کی تخت نشینی سے خلجی خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا، دہلی کا یہ نیا حکمراں بہت ہی دیندار اور شریعت کا پاس کرنے والا، خوش خلق اور منکسر المزاج تھا۔ اس کے بادشاہ ہونے پر ملک بھر میں امن و چین کی سانس لی گئی اور چونکہ اس نے سارے ملک کو ایک پر آشوب دور اور ایک ظالم حکمراں کے پنجے سے نجات دلائی تھی، اسی لیے لوگوں

---

(۱) شعر العجم دوسری جلد (ص ۱۲۲)

کے دلوں میں اس کی بڑی عزت تھی چنانچہ امیر خسرو نے ایک مرثیے میں قطب الدین مبارک شاہ کے قتل کا ذکر کرنے کے بعد سلطان غیاث الدین تغلق کی تعریف یوں بیان کی ہے:

"بادشاہ غیاث الدین ابو مسلم ثانی ہے جس نے اپنی تلوار کے وار سے تاج جدید کے خون کا انتقام لیا ہے ۔۔۔ وہ حامی اسلام تغلق شاہ ہے کہ ستاروں نے سیاسال کی گردش کے بعد ایسا دین پرور بادشاہ پیدا کیا ہے (۱) "

شبلی نعمانی نے غیاث الدین تغلق سے امیر خسرو کے تعلقات کے بارے میں لکھا ہے۔

" ۔ ۔ امیر خسرو کی اس نے نہایت قدردانی کی اور ان کو دولت سے نہال کر دیا۔ امیر نے بھی اس کے احسانات کا حق ادا کیا۔ چنانچہ اس کے نام پر "تغلق نامہ" لکھا جو تغلق کے عہد کی مفصل تاریخ ہے۔ (۲) "

سلطان غیاث الدین تغلق کے ساتھ امیر خسرو بھی کئی مہموں میں شریک ہوئے، چنانچہ جب وہ "ترہٹ" اور سنارگاؤں کی مہم پر جانے لگا تو انھیں بھی اپنے ساتھ لیتا گیا، کچھ دنوں بعد شاہی لشکر جب فتح مندی کے شادیانے اور نقارے بجاتا ہوا دہلی کی طرف آرہا تھا تو سبز رو جوناخاں نے بادشاہ کے استقبال کے لیے "افغان پور" میں لکڑی کا ایک عارضی محل تیار کرایا جس میں سلطان نے قیام کیا۔ مگر محل کے یکایک منہدم ہو جانے سے وہ دب کر مر گیا۔ اسی اثنا میں بقول پروفیسر وحید مرزا:

" ۱۸ ربیع الاول ۷۲۵ ہجری کو امیر خسرو کے مرشد حضرت نظام الدین اولیا نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ خسرو بادشاہ غیاث الدین تغلق کے ساتھ ترہٹ کی مہم پر گئے ہوئے تھے، جب دہلی آئے تو یہ اندوہناک خبر سن کر رنج والم سے وارفتہ ہو گئے، کپڑے پھاڑ ڈالے اور منہ پر کالک مل کر ان کی قبر کی زیارت کو پہنچے، وہاں آپ نے یہ دوہا پڑھا اور بے ہوش ہو کر گر گئے۔

(۱) امیر خسرو (ص ۱۲۹) (۲) شعر العجم دوسری جلد ص ۱۳۳)

گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے رین بھی سب دیس

اپنے مہربان مرشد کے بعد خسرو زیادہ عرصے تک زندہ نہ رہے۔ طبیعت افسردہ اور ملول ہو چکی تھی اور اگرچہ محمد تغلق کی تخت نشینی کے بعد ایک آدھ قصیدہ اس کی تعریف میں کہا۔ شاعری سے بھی ان کا دل سرد ہو چکا تھا۔ انھوں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اب زیادہ عرصے زندہ نہ رہوں گا۔ چنانچہ وہی ہوا کہ ۱۸ ر شوال کو وہ بھی اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے (۱)''

---

(۱) امیر خسرو (ص ۱۸۶)

چھٹا باب

امیر خسرو کے گھریلو حالات

جب امیر خسرو بہت کمسن تھے تبھی ان کے والد امیر سیف الدین محمود رحلت کر گئے تھے۔ اس کے بعد وہ اپنے مہربان نانا نواب عماد الملک کی شفقت و محبت کے سایے تلے بڑے اور پروان چڑھے، مگر جب ان کا بھی انتقال ہو گیا تو خسرو کے لیے صرف بوڑھی ماں کی آغوش اور باہیں رہ گئیں۔ جن میں سما کر وہ دنیا کے سارے رنج و غم سے بے نیاز ہو جاتے اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا کرتے تھے، خسرو کے کلام کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اپنی والدہ "دولت ناز" (۱) سے عشق کی حد تک محبت تھی اور دہلی سے دور رہ کر ان کی آغوش اور باہوں میں سما جانے کے لیے ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپتے رہتے تھے۔

امیر خسرو کو اپنے وطن ہندوستان سے بے پناہ اور والہانہ محبت تھی، وہ اپنی تاریخی مثنوی "قران السعدین" میں ہندوستان کو مکّہ پر ترجیح دیتے ہوئے کہتے ہیں:

---

(۱) خسرو شناسی (ایک سوانحی مطالعہ) مرتبہ ظ انصاری و ابو الفیض سحر (ص ۱۲)

گر شنود قصۂ این بوستان
مکہ شود طایفِ ہندوستان
(اس بوستان کا قصہ سن کر مکہ بھی اسکا طواف کرنے لگے (۱))

ہندوستان سے خسرو کو جو جذباتی لگاؤ اور عقیدت تھی اس کی بڑی وجہ ماں سے ان کی غیر معمولی اور جذباتی محبت تھی، کیونکہ انھوں نے جو کچھ بھی ورثے میں پایا، وہ نانا اور ماں کی طرف سے پایا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ والدہ بھی اپنے تینوں بیٹوں اور ایک صاحبزادی میں سب سے زیادہ امیر خسرو کو چاہتی تھیں۔ خسرو کی جدائی انھیں ایک لمحے کے لیے بھی گوارا نہ تھی، وہ ایسے ایسے جذبات سے بھرپور خطوط لکھا کرتی تھیں کہ انھیں پڑھکر خسرو دہلی پہنچنے کے لیے تڑپ اٹھتے تھے۔ اگرچہ کسب معاش اور ملازمت کے سلسلے میں اپنے مربیوں کو خوش رکھنے کے لیے انھیں کئی بار دہلی سے باہر جانا پڑا، لیکن زندگی کی تمام آرام و آسائش کی فراہمی کے باوجود کہیں بھی وہ زیادہ عرصہ تک نہ رہ سکے۔ شاہی لشکر کے ساتھ جب وہ لکھنوتی گئے تو بغرا خاں نے وہاں کا حاکم ہو جانے کے بعد انھیں روکنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ نہیں رکے اور آخر کار معذرت پیش کر کے غیاث الدین بلبن کے شاہی لشکر کے ساتھ دہلی گئے۔ خسرو کو سب سے زیادہ قدر و منزلت اگر کسی امیر یا شہزادے نے دی تھی تو وہ شہزادہ محمد تھا اور اس کے علاوہ ملتان کا علمی و ادبی ماحول اگر دہلی سے زیادہ بارونق نہیں تو دہلی سے کم بھی نہ تھا، لیکن اس کے باوجود ان کو وہاں بھی دہلی کی یاد ہمیشہ ستاتی رہتی تھی۔

جب بغرا خاں سے مصالحت کے بعد معز الدین کیقباد دہلی جانے لگا تو راستے ہی میں اس نے امیر علی سرجاندار کو اودھ کی حکومت بخش دی، چونکہ امیر خسرو پہلے ہی سے اس سے وابستہ تھے اس لیے انھیں بھی مجبوراً اس کے ساتھ وہاں

---

(۱) خسرو شناسی (ایک سوانحی مطالعہ) مرتبہ ظ انصاری، ابوالفیض سحر (ص ۱۲)

جانا پڑا، وہ وہاں دو سال تک بڑے عیش و آرام اور عزت و احترام کے ساتھ رہے، لیکن ماں کے خطوط پڑھ پڑھ کر وہ بے چین ہو جاتے تھے اور آخر کار ایک روز امیر سے اپنی دلی کیفیات بیان کر کے رخصت کی اجازت حاصل کر لی چنانچہ اسی زمانے میں وہ اپنے ایک عزیز دوست تاج الدین زاہد کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"خان کی عنایتوں نے پردیس کو ایسا خوشگوار بنا دیا کہ مجھے اپنا گھر بھول گیا، یہ دو سال کا عرصہ جو میں نے بسر کیا مال و دولت کے لالچ کی وجہ سے نہیں بلکہ محض اپنے مہربان آقا کی دلجوئی کے خیال سے گذرا۔ میری ضعیف سمجھ دار والدہ دہلی میں تھیں اور مجھے بہت یاد کرتی تھیں۔ ان کے شب و روز مجھ نالائق کے فکر میں بہت اضطراب اور بے چینی سے گذرتے تھے۔ اور میری جدائی کے غم سے بے قرار ہو کر مجھے بار بار واپس آنے کے لیے لکھتی رہتی تھیں۔ میرا دل بھی ان کے غم میں بے چین رہتا تھا، کچھ عرصہ میں اپنا غم کسی نہ کسی طرح غلط کرتا رہا، لیکن جب تابِ ضبط نہ رہی اور شوق بے قابو ہو گیا تو میں نے اپنا ماجرا خان کے سامنے ایک عرضِ حال کی شکل میں پیش کر دیا۔ خان نے اپنی مہربانی اور کرم کے مطابق میری مجبوری کو دیکھا اور خوشی سے مجھے گھر جانے کی اجازت دے دی۔ سفر خرچ کے لیے اس نے مجھے دو کشتیاں سونے کے سکوں کی بھری ہوئی عنایت کیں اور اس طرح اس کے احسان کی شکر گذاری سے اپنے دل کو پُر کر کے میں نے راہِ سفر اختیار کی، شوقِ دید مجھے کشاں کشاں لیے جاتا تھا اور آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں نے راستہ یوں طے کیا جیسے کوئی پیکانِ تیز اثر پرتا ہو۔ اور ایک مہینے تک کہیں قیام نہیں کیا، کیونکہ سفر لمبا تھا اور اشتیاق شدید، یہاں تک کہ عید کے چاند کی طرح خوش خوش ذی القعدہ کے مہینے میں دہلی پہنچا، گلاب کی طرح ہنس ہنس کر میں نے اپنی بھو کی نگاہیں مسرور چہرے پر ڈالیں، دوستوں کی زیارت کا شوق پورا ہوا اور دلی مقصد حاصل ہو گیا۔ گویا ایک پرند جس نے خزاں کی سختیاں جھیلی ہوں، ایک پر بہار چمن میں پہنچ جائے یا کوئی

پیاسا آبِ حیات کے چشمے کو پالے۔ میرا دل، جو رنج سے مردہ ہو چکا تھا، اپنے عزیزوں کو دیکھ کر دوبارہ زندہ ہو گیا اور ہزاروں ممنونِ محبت جذبات کے ساتھ میں نے اپنی آنکھیں اپنی مہربان ماں کے قدموں پر رکھ دیں، میری والدہ نے جن کو میری جدائی نے بیمار اور کمزور کر دیا تھا، مہر و محبت کے چہرے سے نقاب الٹ دی اور مجھے گلے لگا کر خوشی کے آنسو بہا دیے، ان کا غم دیدہ دل اب خوش اور مطمئن ہو گیا اور جو منتیں انھوں نے مان رکھی تھیں سب پوری کیں" (۱)

شبلی نعمانی نے اس واقعے کے بیان میں لکھا ہے:

"دو برس تک اودھ میں رہے، ان کی والدہ کو ان سے بے حد محبت تھی، وہ دلی میں تھیں اور ان کے خطوط آتے رہتے تھے کہ میں تم سے دور رہ کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ امیر کو بھی ماں سے بے انتہا محبت تھی، چنانچہ سب تعلقات چھوڑ کر دلی میں آئے، ماں نے گلے لگایا اور آنکھوں سے محبت کے دریا بہا دیے:"

مادرم آں خستۂ تیمارِ من
چوں نظر افگند بہ دیدارِ من
پردۂ زردی شفقت برگرفت
اشک فشاناں بہ برم در گرفت (۲)

امیر خسرو کو اپنی والدہ سے کیسی محبت تھی، اس کا تذکرہ کرتے ہوئے شبلی نعمانی مزید لکھتے ہیں:

"امیر کو اپنی والدہ سے بے انتہا محبت تھی۔ وہ بڑی عمر کو بھی پہنچ کر وہ اس جوش سے ملتے تھے جس طرح چھوٹے بچے ماں سے لپٹ جاتے ہیں۔۔۔۔
ایک موقع پر ماں سے ملے ہیں اور ماں نے سینے سے

---

(۱) اعجازِ خسروی رسالہ ۵ (ص ۲۰ و ما بعد) — یہ خط رجب سنہ ۶۸۷ ہجری میں لکھا گیا تھا (خوشنوازِ خسرو مولفہ پروفیسر وحید مرزا (ص ۹۹) (۲) شعر العجم دوسری جلد (ص ۱۱۶)

لگا لیا ہے تو ایک شعر بے اختیار زبان سے نکلا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ماں کا سینہ بہشت ہے، چنانچہ وہ نہریں دودھ کی اس میں جاری ہیں ۔۔۔ (۱)"

امیر خسرو کی والدہ، جنھیں وہ دنیا کے تمام انسانوں سے زیادہ عزیز رکھتے تھے اور ان کے چھوٹے بھائی حسام الدین قتلغ، دونوں نے ایک ہی سال ۶۹۸ ہجری میں انتقال کیا، یہ جانکاہ صدمہ ایسا تھا کہ خسرو اس کی تاب نہ لا سکے اور اڑتالیس سال کی عمر میں والدۂ مرحومہ کو یاد کر کے اس طرح بلکتے ہیں، جیسے کوئی کمسن بچہ ماں کیلیے بلکتا ہے، چنانچہ "لیلا مجنوں" میں ماں اور بھائی دونوں کا مرثیہ لکھا ہے جسے پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر شعر خون جگر سے رنگین ہے:

امسال دو نور ز اخترم رفت
ہم مادر وہم برادرم رفت

یک ہفتہ ز بخت خفتۂ من
گم شد دو مہ دو ہفتۂ من

چوں مادر من بزیر خاک است
گر خاک بسر کنم چہ باک است

ای مادر من کجائی آخر
روی از چہ نمی نمائی آخر

ہر جا کہ زپائی تو غباری است
ما را ز بہشت یادگاری است

---

(۱) شعر العجم دوسری جلد (ص ۱۲۹)

ذات تو کہ حفظ جان من بود
پشت من و پشت بان من بود

روزی کہ لب تو در سخن بود
پند تو صلاح کار من بود

امروز منم بہ مہر پیوند
خاموشی تو ہمی دہد پند (۱)

امیر خسرو کی شادی کب ہوئی، کس سے ہوئی، اور کہاں ہوئی، کچھ معلوم نہیں، کیونکہ نہ تو اس بابت میں خود امیر خسرو نے کچھ لکھا ہے اور نہ ہی ان کے کسی معاصر مورخ یا تذکرہ نویس نے کچھ نشاندہی کی ہے، یہ بات معلوم نہیں ہوتی کہ ان کے انتقال کے وقت ان کی بیوی زندہ تھیں یا رحلت کر چکی تھیں، البتہ جس زمانے میں خسرو شہزادہ محمد کے ساتھ ملتان میں رہ رہے تھے اس وقت ان کی شادی ہو چکی تھی پروفیسر وحید مرزا نے اسوقت خسرو کا ایک بیان نقل کیا ہے جب وہ ملتان میں تھے،

"..... وہاں میرے دن سیر اور تماشے میں اور راتیں ایک محبوب کی صحبت میں بسر ہوتی تھیں..... (۲)

امیر خسرو نے اس اقتباس میں دہلی کے سیر تماشے کی طرف اشارہ کیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس محبوب کی صحبت میں راتیں بسر ہونے کا ذکر انھوں نے کیا ہے وہ ان کی بیوی ہی ہوں گی کیونکہ ایک تو ان کے کلام سے کسی محبوب مجازی کا پتا نہیں چلتا اور دوسرے یہ کہ اگر ان کی زندگی میں کسی محبوبۂ مجازی کا وجود ہوتا بھی تو وہ اتنے بے باک

(۱) شعرالعجم دوسری جلد (ص ۱۳۷-۱۳۶)

(۲) امیر خسرو مولفہ وحید مرزا (ص ۶۸)

نہیں تھے کہ اسکا تذکرہ اس طرح بے محابا کر دیتے۔

امیر خسرو کی اولاد میں ایک صاحبزادی تھیں جن کا نام عفیفہ تھا۔ ان کی پیدائش پر انھوں نے قدرے ناگواری محسوس کی تھی، حیرت اس بات کی ہے کہ وہ امیر خسرو جو اپنی ماں سے دنیا کے تمام انسانوں سے زیادہ محبت کرتے تھے، اپنی بیٹی کے پیدا ہونے پر ناگواری کا اظہار کر بیٹھے، جبکہ دونوں عورتیں تھیں اور دونوں ہی کی سرشت ایک تھی۔ شبلی نعمانی نے صاحبزادی کی پیدائش پر امیر خسرو کے رنج و ملال کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"امیر خسرو کی ایک صاحبزادی تھیں لیکن سخت افسوس ہے کہ اس زمانہ میں عورتوں کی ایسی بیقدری تھی کہ امیر کو ان کے پیدا ہونے کا رنج تھا، جب وہ سات برس کی ہوئیں تو امیر نے "لیلا مجنوں" لکھی، اس میں صاحبزادی سے خطاب کرتے ہیں:

ای زعفت فگندہ برقع نور
ہم عفیفہ بنام و ہم مستور

کاش ماہ تو ہم بچہ بودی
دررحم طفل بشت مہہ بودی

لیک چون دادہ خدای رواست
باخدا دادگان ستیزہ خطا است

من پذیرفتم انچہ یزداں داد
کانچہ اوداد باز نتواں داد

پدرم ہم زمادراست آخر
مادرم نیز دختراست آخر

پہلے آرزو کی ہے کہ کاش تم نہ پیدا ہوتیں، یا ہوتیں تو بیٹی کے بجائے بیٹا ہوتیں، پھر طرح طرح کی تاویلوں سے دل کو تسلی دی ہے کہ خدا کے دیے کو کون ٹال سکتا ہے اور آخر میرا باپ بھی تو عورت سے پیدا ہوا اور ماں بھی تو آخر عورت ہی تھی۔

صاحبزادی کو جو نصیحتیں کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں عورتوں کی حالت نہایت پست تھی۔ امیر خسرو اس قدر صاحب دولت و ثروت تھے لیکن بیٹی سے کہتے ہیں کہ خبردار چرخہ کا تانا چھوڑنا اور کبھی موکھے کے پاس بیٹھ کر اِدھر اُدھر نہ جھانکنا:

دوک و سوزن گذاشتن نہ فن است
کآلت پردہ پوشی بدن است

پا بہ دامان عافیت سر کش
رو بہ دیوار و پشت بر در کن

در تماشائی روزنت ہوس است
روزنت چشم سوزن تو بس است (۱)

امیر خسرو کے تین بیٹے تھے جن میں سے دو بیٹوں، حاجی اور محمد کا انتقال ان کی زندگی ہی میں ہو چکا تھا (۲) مگر ان کے تیسرے بیٹے جن کا نام ملک احمد تھا (۳)، ان کے بعد تک زندہ رہے تھے۔ لیکن یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان کی صاحبزادی ان کے انتقال کے وقت حیات تھیں یا نہیں۔ ملک احمد شاعر تھے اور اپنے نامور باپ کے اثر سے فیروز شاہ تغلق کے دربار میں ندیم تھے، لیکن وہ شاعر کی حیثیت سے اسقدر مشہور نہ ہو سکے جتنا کہ ان کو ہونا چاہئے تھا، اس کے باوجود

(۱) شعر العجم دوسری جلد (ص ۱۲۶-۱۲۵) (۲) امیر خسرو مولفہ وحید مرزا (ص ۱۹۰)
(۳) شعر العجم دوسری جلد (ص ۱۲۶-۱۲۵)

وہ فنِ شعر کے رموز و دقایق سے واقف تھے اور شعر کے محاسن و معایب سے پرکھنے میں انھیں ملکہ حاصل تھا۔ شبلی نعمانی ان کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> لیکن انصاف یہ ہے کہ امیر خسرو کی یادگار سے ہم بہت زیادہ توقع رکھتے تھے ، بدایونی نے . . . . . . سچ لکھا ہے کہ ملک محمد چونکہ خسرو کی یادگار تھے اس لیے بادشاہ اور دربار اس کو بھی امیر کا تبرک سمجھتے تھے اور غنیمت جانتے تھے (۱) ۔

---

(۱) شعر العجم دوسری جلد (ص ۱۲۵ - ۱۲۴)

ساتواں باب

امیر خسرو اور نظام الدین اولیا

سلطان محمود غزنوی بہت بڑی قوت ارادی کا مالک اور بڑے ہی جاہ و جلال کا بادشاہ گذرا ہے۔ اس نے نہ صرف اپنی سلطنت کو وسیع اور مستحکم کیا بلکہ دوسرے ممالک کو فتح کر کے وہاں کی دولت غزنین میں لا جمع کی۔ وہ اپنی دلیری، جنگجوئی اور فتوحات کی ہوشیاری کے لیے بھی مشہور ہے۔ اس نے ہندوستان پر پے در پے سترہ حملے کیے اور یہاں سے بے پناہ اور بے شمار مال غنیمت سمیٹ کر لے گیا۔ وہ اگر چاہتا تو جیسا کہ اس کی فتوحاتِ ہند سے ظاہر ہے، ہندوستان میں ایک مضبوط اور وسیع اسلامی سلطنت کی داغ بیل ڈال سکتا تھا، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ ہندوستان سے سمیٹی ہوئی دولت سے اپنی راجدھانی غزنین کو ایسا آراستہ و پیراستہ کیا اور وہ چہل پہل پیدا کی کہ ایسی علمی و ادبی رونق کی مثالیں تاریخ میں بہت کم ملتی ہیں۔ سلطان شہاب الدین محمد غوری وہ پہلا حکمراں ہے جس نے محمود غزنوی

کے حملوں کے تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد دہلی میں اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالی اور اپنے وفادار ترک غلام قطب الدین ایبک کو یہاں اپنا نایب مقرر کر کے واپس چلا گیا۔ دہلی میں اسلامی حکومت کی تاسیس کے بعد وہ مسلمان فوجی یہیں رہ گیے جو شہاب الدین غوری کے ساتھ آیے تھے، البتہ ان میں سے کچھ لوگ واپس بھی چلے گیے تھے لیکن رفتہ رفتہ دوسرے اسلامی ممالک سے ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔

یہ درست ہے کہ شمالی ہند میں مسلمان علما و فضلا اور اکابرین کی آمد اس وقت سے شروع ہوئی جب دہلی میں مسلمانوں کی حکومت قایم ہو گئی۔ لیکن یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ محمود غزنوی کے حملوں کے بعد اور شہاب الدین غوری کی فتوحات سے قبل جو ڈیڑھ سو سال کا عرصہ گذرا ہے، اس درمیانی مدت میں حکومت کی پشت پناہی اور جہانبانی و جہانگیری کے خیال کے بغیر شمالی ہند میں مسلمان تاجروں اور صوفیوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا، اور یہ لوگ ملک کے مختلف شہروں میں سکونت اختیار کرنے لگے تھے۔ ان لوگوں نے اس اجنبی ملک میں ناساعد حالات اور مخالف ماحول کے تیز و تند اور ہولناک طوفانوں کے زمانے میں بھی اپنے اسلامی وجود کی بقا اور روشن مستقبل کی تعمیر کے لیے بھرپور جد وجہد کی اور اپنے کردار کی عظمت و پختگی کا چراغ جلایے رکھا، اور اپنی مسجدیں بنائیں، خانقاہیں قایم کیں اور مدرسے کھولے۔ جن شہروں میں یہ مسلمان آکر آباد ہوے تھے ان میں شہر بدایوں کو ایک خاص مقام اور اہمیت حاصل ہے۔ بدایوں کی عظمت و اہمیت اس وقت اور بڑھ گئی جب وسط ایشیا میں فتنۂ مغول نے سر اٹھایا اور چنگیز خاں کی قیادت میں صحرایے گوبی کے وحشیوں نے اسلامی دنیا کے عظیم مذہبی و تہذیبی مرکز غارت کر دییے۔ اس زمانے کے ہندوستان میں دہلی اور بدایوں باہر سے آنے والے مسلمانوں کی دلکشی کا مرکز بنے ہوے تھے۔ جن لوگوں کو اقتدار، جاہ و حشمت اور مال و دولت کی خواہش ہوتی تھی وہ دہلی میں رک جاتے تھے کیونکہ دارالسلطنت میں بہر صورت رنگینیاں زیادہ تھیں لیکن جو لوگ پر سکون اور علمی زندگی کے عادی تھے وہ بدایوں کا رخ

کرتے تھے۔ بدایوں کی مذہبی اور علمی و ادبی زندگی اور یہاں کے علما و فضلا اور صوفیا کی مذہبی اور علمی خدمات کا بیان کرتے ہوئے پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں :

"اسلامی ہند کی سیاسی اور تمدنی تاریخ میں بدایوں کو خاص مقام اور اہمیت حاصل ہے۔ صدیوں تک یہ شہر علم و فضل کا مرکز اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہا ہے۔ اس کی خانقاہوں اور مدرسوں سے رشد و ہدایت کے جو چشمے ابلے ہیں ان سے ملک کا چپہ چپہ اور گوشہ گوشہ سیراب ہوا ہے۔ صدہا گم گشتگان راہ طریقت نے یہاں آکر روشنی حاصل کی ہے اور ہزاروں تشنگان علم نے یہاں اپنی پیاس بجھائی ہے۔ بغداد، بخارا، یمن، نخشب، سہرورد، مغزیں اور غور کے کتنے بے گشتہ قسمت انسانوں نے اس کی خاموش علمی فضا اور روح پرور ماحول میں اطمینان اور سکون کا سانس لیا ہے۔ شیخ نظام الدین اولیا جن کا آفتاب ہدایت تقریباً نصف صدی تک اس ملک پر چمکتا رہا ہے۔ بدایوں ہی کی آغوش میں پلے اور بڑھے تھے۔ طوطیٔ ہند امیر خسرو کو اصلاح سخن کے لیے جس در پر سر جھکانا پڑا تھا۔ وہ بدایوں ہی کے ایک بزرگ شہاب مہمرہ کا آستانہ تھا۔ سعدیٔ ہند خواجہ حسن سنجری اسی خطہ زمین کی پیداوار تھے۔ ہر چند کہ صدیاں گزر چکی ہیں لیکن آج بھی جب بدایوں کے اس دور اول کا خیال آتا ہے تو تحقیق وارشاد، تزکیۂ نفس، تجلیۂ باطن اور شعر و سخن کی ہزارہا محفلیں تصور میں جگمگا اٹھتی ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زمان و مکان کی ساری پنہائیاں سمٹ گئی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ (۱)"

خواجہ نظام الدین ہندوستان کے اسی تاریخی شہر بدایوں میں پیدا ہوئے تھے فرشتہ نے ان کے والد کا نام احمد بن دانیال لکھا ہے جو غزنین سے ہندوستان آئے تھے۔ لیکن پروفیسر وحید مرزا نے مصنف اخبار الاخیار کے قول کے مطابق ان کے والد کا نام احمد اور دادا کا نام خواجہ علی۔ فارسی بتایا ہے اور یہ لکھا ہے کہ وہ بخارا سے آکر کچھ دنوں لاہور

---

(۱) تاریخی مقالات (ص ۳۰۔۲۹)

میں رہے اور پھر بدایوں میں مقیم ہوگیے (۱) اس بیان کا ثبوت پروفیسر خلیق احمد نظامی کے بیان سے بھی ملتا ہے کہ حضرت شیخ نظام الدین اولیا کے دادا اور نانا جو سرکاری ملازمت کو پسند نہیں کرتے تھے اور گوشۂ تنہائی میں زندگی گذارنا چاہتے تھے جب ہندوستان آیے تو بدایوں ہی کو اپنا مستقر بنالیا (۲)۔ خواجہ نظام الدین اولیے کے اجداد غزنین سے آیے تھے یا بخارے سے، اس سے قطع نظر یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ وہ بدایوں ہی کی خاک سے اٹھے تھے اور یہی سرزمین ان کا وطن ہے جس کا ذکر وہ اکثر اپنی مجلسوں میں نہایت محبت و عقیدت کے ساتھ کیا کرتے تھے، چنانچہ خواجہ حسن سنجری نے اپنی تالیف فوائد الفواد میں خواجہ نظام الدین اولیا کا قول نقل کیا ہے:

"در بدایوں بسیار بزرگان خفتہ اند" (۳)

جب خواجہ نظام الدین کی عمر صرف پانچ سال کی تھی اسی وقت ان کے والد خواجہ احمد اس دنیا سے رخصت ہو گیے، اور اگرچہ وہ اس وقت اپنی خرد سالگی کی وجہ سے شعور کی اس منزل کو نہیں پہنچے تھے جہاں باپ کی موت کا غم یتیم بیٹے کو احساس کے جہنم میں جلا دیتا ہے، لیکن بے یاری اور کسمپرسی کی حالت میں صعوبتوں اور فاقہ مستیوں سے بھری ہوئی جو زندگی انھوں نے بچپن ہی سے جھیلی تھی، وہ دینی رہنمائی اور روحانی پیشوائی کے بلند مرتبے تک انھیں پہنچانے کا پہلا زینہ ثابت ہوئی۔ ان کی بیوہ ماں بی بی زلیخا نے میٹھی میٹھی لوریاں اور دلچسپ قصوں کے پیرایے میں خدا اعتمادی، خود اعتمادی کا جو سبق پڑھایا تھا، وہ ان کی زندگی کا مقدم ترین اصول بن گیا اور فاقوں کی شفقتوں و صعوبتوں کی لذت سے ایسے آشنا ہوے کہ ساری زندگی روزے رکھ کر گذار دی۔ وہ بچپن کی بوریا نشینی کو اپنی زندگی کا ایسا معمول بنا چکے تھے کہ کبھی دنیاوی مال و متاع اور جاہ و اقتدار کی طرف راغب نہیں ہوے۔ وہ نہ خود کبھی کسی بادشاہ کے دربار

---

(۱) امیر خسرو (ص ۱۵۴) (۲) تاریخی مقالات (ص ۴۳)

(۳) تاریخی مقالات (ص ۴۴)

ہیں گیے اور نہ کبھی کسی بادشاہ کو اپنی خانقاہ میں حاضر ہونے کی اجازت دی۔ ان کی والدہ نے تمام تر غربت و افلاس کے باوجود مدرسے سے ان کی غیر حاضری کو کبھی برداشت نہیں کیا اور انھیں علم و فن سے بہرہ ور کرانے کے لیے اپنی بساط بھر کوشش کی۔ خواجہ ایک بیوہ ماں کے اکلوتے بیٹے تھے۔ دنیا میں ان کا کوئی پرسان حال۔ تھا نہ تھی، مگر وہ خدا کے مہمان تھے۔ خدا نے جو کچھ انھیں دیا تھا، وہ اس کا شکر بجا لاتے تھے۔ اور جو کچھ نہیں ملا اس کا شکوہ کبھی نہیں کیا۔ ماں نے صبر کی تلقین کرتے ہوئے جس طرح بیٹے کے دل میں خدا کی عظمت کا سکہ بٹھایا، اس کی ایک مثال یہ ہے:

"شیخ نظام الدین اولیا تمام دن مدرسہ میں گذارنے کے بعد بھوک کی شدت سے نڈھال اپنی بیوہ ماں کے پاس کھڑے ہیں اور وہ ان کے سر پر ہاتھ رکھ کر فرمتی ہیں:
" نظام الدین ام روز ما مہمان خدا ایم " (۱)

باپ کی وفات کے بعد خواجہ اپنی والدہ کے ساتھ بدایوں سے دہلی آ گیے جہاں بلبن کے ایک وزیر اور مشہور مفتی و عالم شمس الدین خوارزمی سے ان کو استفادہ کرنے کی سعادت نصیب ہو گئی اور استاد نے بھی اپنے ہونہار شاگرد کو ایسی توجہ سے تعلیم دی کہ بارہ سال کی عمر کے لگ بھگ وہ تمام علوم و فنون میں کامل ہو گیے۔ بابا فرید گنج شکر کے ایک بھائی نجیب الدین المتوکل کے گھر سے بھی خواجہ کا تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ ایک روز ان کے یہاں ایک قوال آیا جس نے اجودھن میں بابا فرید کی خانقاہ میں کچھ دن رہ کر ان کی زندگی اور معمولات کا مشاہدہ کیا تھا۔ اس نے ان کی درویشانہ زندگی کی تعریف ایسے دلکش پیرایے میں بیان کی کہ خواجہ کو بھی ان کی زیارت کا اشتیاق ہوا اور وہ اجودھن چلے گیے۔ بابا فرید نے بڑی محبت سے انھیں عرفان و تصوف کے رموز و اسرار سے واقف کرایا اور سلوک کے مدارج بھی طے کرا کے ایک جبہ اور ایک سجادہ کے ساتھ دہلی میں اپنا نایب مقرر کر کے رخصت کیا۔

---

(۱) تاریخی مقالات (ص ۴۴)

دھلی اس زمانے میں ہر قسم کے لوگوں کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی اور خواص و عوام میں برائیاں ایسی سرایت کی ہوئی تھیں کہ بادشاہ کے محل سے لیکر ہر امیر اور ہر شہری کے گھر میں رقص و سرود کی محفلیں گرم رہتی تھیں اور ہر موڑ پر دعوتِ گناہ دینے والی حسیناؤں کا جمگھٹ نظر آتا تھا۔ خواجہ اپنی خاموش اور تنہائی پسند طبیعت کے باعث شہر سے بہت دور رہنا چاہتے تھے، مگر چونکہ دین کے سچے راستے سے بھٹکے ہوئے لوگوں کی اصلاح کرنا ہی ان کا منصب تھا، اس لیے انھوں نے اپنی سکونت کے لیے ایک ایسی جگہ کا انتخاب کیا جو نہ شہر سے بہت دور تھی اور نہ شہر میں تھی۔ دہلی سے تھوڑے فاصلے پر غیاث پور نام کے ایک گاؤں میں انھوں نے چشتیہ سلسلے کی اس خانقاہ کی بنیاد ڈالی جہاں سے تقریباً پچاس سال تک بے شمار مردہ دلوں اور بیمار روحوں کو زندگی اور تازگی ملتی رہی۔ خواجہ نظام الدین کی روحانی عظمت کا اندازہ اس واقعے سے ہوتا ہے کہ جب بابا فرید کی وفات کا وقت قریب آیا تو انھوں نے اپنے بیٹوں اور بھانجے علاؤ الدین صابر کلیری کی بجائے چشتیہ سلسلے کی پیشوائی اور اپنی جانشینی کے لیے خواجہ نظام الدین کو نامزد کیا اور اس طرح وہ اس سلسلے کے چوتھے پیشوا اور صدر ہو گیے۔ جب وہ اپنے بزرگوں کی جگہ پر بیٹھے تو تبلیغ و تلقین اور رشد و ہدایت کے فرائض ایسی تندہی سے انجام دینے لگے کہ چشتیہ سلسلے کے مسلک کی سرگرمیاں پہلے سے اور زیادہ بڑھ گئیں۔ انھوں نے اپنے معاصر مشائخ کی ریشہ دوانیوں اور حکمرانوں کی مخاصمت کے باوجود اس چراغِ روحانیت کو اپنے خونِ جگر سے روشن کیے رکھا جسے سب سے پہلے خواجہ معین الدین چشتی نے اجمیر میں جلایا تھا۔

خواجہ نظام الدین کے مریدوں اور معتقدوں میں ہر فرقے اور ہر طبقے کے لوگ تھے کیونکہ وہ کسی جھجک کے بغیر ہر شخص کو اپنے حلقے میں شامل کر لیتے تھے اور یہ انھیں کے عمل اور فیضان کا نتیجہ ہے کہ خسرو کی شاعری، ہندوستانی قومیت اور تہذیبی یگانگت کا بہترین پیام مانی جاتی ہے۔ انھوں نے نکاح نہیں کیا تھا اور زندگی بھر کے لیے جنسی لذت آشنائی کے دروازے بند کر دیے تھے، جس کا نتیجہ

یہ ہوا کہ بہت جلد ان کی دینداردانہ زندگی کی شہرت دہلی اور اس کے گرد نواح میں پھیل گئی اور دور دراز صوبوں اور شہروں کے لوگ ان کی خانقاہ میں حاضر ہوکر روحانیت کی روشنی حاصل کرنے لگے۔ ہر وقت ان کے آستانے پر معتقدوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی اور دہلی کے حکمران بھی بڑے اعتقاد کے ساتھ ان کی خانقاہ میں حاضر ہونے کی تمنا کرتے تھے، مگر انھوں نے کبھی کسی کو آنے کی اجازت نہیں دی۔ جہاں دہلی کے بیشتر بادشاہ خواجہ کے معتقد اور مداح تھے وہیں مبارک شاہ خلجی اور غیاث الدین تغلق نے ان سے مخاصمت بھی مول لی تھی۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ جب غیاث الدین تغلق لکھنوتی کی مہم پر جانے لگا تو اس نے خواجہ کو حکم دیا کہ وہ اس کے دہلی آنے سے پہلے کہیں اور چلے جائیں، ورنہ خانقاہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی جائے گی۔ کچھ عرصے بعد جب وہ فتح و کامرانی کے نشے سے چور ہوکر دہلی آنے لگا تو شہر سے تھوڑی دور افغان پور میں شہزادہ جونا خان نے باپ کے استقبال کے لیے لکڑی کا ایک عارضی محل تیار کرایا، جس میں بادشاہ نے قیام کیا، سلطان کی آمد کی خبر سن کر خواجہ کے مریدوں نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ دہلی چھوڑ کر چلے جائیں، کیونکہ ہر شخص بادشاہ کی مخاصمت سے خوفزدہ ہوگیا تھا، مگر خواجہ نے اس کے جواب میں مریدوں سے کہا :

"ہنوز دلّی دوراست"

کہا جاتا ہے کہ یہ خواجہ ہی کی کرامت تھی کہ لکڑی کا محل منہدم ہوجانے سے غیاث الدین تغلق وہیں دب کر مرگیا اور اسے دوبارہ دہلی آنا نصیب نہ ہوسکا۔

تیرھویں صدی عیسوی میں خواجہ نظام الدین نے اس وقت دین کی گرانمایہ خدمات انجام دیں جب دہلی میں ہر چہار طرف بے دینی کا چرچا تھا اور بادشاہ اور امرا ملک گیری اور اقتدار کی ہوس میں اسلامی اصولوں کو فراموش کرچکے تھے۔ ہر شخص ایک دوسرے کا دشمن تھا اور منافقت عام تھی۔ خفیہ سازشوں کا ایک جال بچھا ہوا تھا اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ کون، کب، کس کے جال میں پھنس جائے۔ کسی کو زہر

دیکر مار دینا ایک معمولی کھیل تھا جو خوب جی بھر کے کھیلا جاتا تھا۔ بادشاہ اور امرا شراب اور عورت کے عادی تھے۔ ہر راستے اور ہر گلی میں بازاری عورتوں کی نیم عریاں جوانی کی شراب چھلکتی تھی اور ہر نوجوان اپنی آسودگیٔ نفس کے لیے بدمست ہو کر پینا تھا۔ گناہوں کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں خواجہ نظام الدین کی ذات نیکی، پارسائی، دینداری اور خدا ترسی کا ایک روشن مینارہ بن کر نمودار ہوئی۔ انھوں نے دہلی کے دوسرے مشائخ کے برعکس خود کو اقتدار کی ہوس سے کنارے رکھا اور کبھی ملکی سیاست میں دخل نہیں دی۔ ان کا منصب گناہگاروں اور بدکرداروں کی اصلاح کرنا تھا اور انھوں نے اسی فرض کی انجام دہی میں ساری زندگی وقف کر دی۔ ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ ایک ایک رات اور ایک ایک دن پیغمبر اسلام کی پیروی میں گذرتا تھا۔ ان کی زندگی کیا تھی گویا حیات پیغمبر کی سراپا تقلید تھی جس نے ان کے آستانے پر سر نیاز خم کر دیا اسے وہ روشنی اور سربلندی ملی کہ پھر دنیا کی حسین سے حسین چیز بھی اس کا دل نہ لبھا سکی اور دیکھتے ہی دیکھتے ساری دلی ان کی گرویدہ ہو گئی تھی۔ ان کی دینی خدمات کا اس سے بڑا ثبوت اور ان کی دیندارانہ زندگی کا اس سے بڑا کرشمہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ دہلی جہاں گناہوں اور بربادیوں کا چرچا تھا وہاں اب گھر گھر میں دین کا چرچا شروع ہو گیا اور گلیوں اور بازاروں کا ماحول بھی دیندارانہ ہو گیا بازاری عورتیں گوشہ نشین ہو گئیں اور شراب کے مٹکے نالوں میں لنڈھائے جانے لگے خواجہ نظام الدین کے روحانی تصرف اور دہلی کے دیندارانہ ماحول کا نقشہ کھینچتے ہوئے برنی نے لکھا ہے:

> ...... شہر کا کوئی محلہ ایسا نہ تھا کہ جہاں بیسویں دن یا ہر مہینے لوگ جمع ہو کر سماع میں شریک نہ ہوتے ہوں اور وجد کی حالت میں نالہ و بکا ذکر تے ہوں، خود سلطان علاءالدین اپنے خاندان سمیت آپ کا معتقد تھا اور سب قسم کے لوگوں کے دل نیکی اور راستبازی کی طرف مائل ہو چکے تھے، چنانچہ علاءالدین کے آخری دور میں یہ کیفیت تھی کہ شراب، عورت،

جو بے اور بری باتوں کا نام بھی لوگوں کی زبان پر نہ آتا تھا، زیادہ تر امرا اور بڑے لوگ اور طلاب جو شیخ کی خدمت میں حاضر رہتے تھے، مذہبی کتابوں کے مطالعے میں مصروف نظر آتے تھے، ایسی کتابیں جیسے احیاء العلوم اور اس کا ترجمہ، عوارف، کشف المحجوب، قوۃ القلوب، شرح تعرف، رسالۂ قشیری، مرصاد العباد، مکتوبات عین القضاۃ، قاضی حمید الدین ناگوری کی کتابیں کوائف اور لوائح اور امیر حسن کی تصنیف فوائد الفواد کے بہت سے گاہک مشتاق رہتے تھے، اور کتب فروشوں کی دکانوں پر لوگ زیادہ تر تصوف اور حقایق کی کتابیں دریافت کیا کرتے تھے۔ کوئی پگڑی ایسی نظر نہ آتی تھی جس میں مسواک اور کنگھا نہ ہو اور چمڑے کے بنے ہوئے لوٹے اور برتن صوفی خریداروں کی کثرت کے سبب بہت گراں ہو گئے تھے (۱)۔

خواجہ نظام الدین اپنے تمام مریدوں کو ملکی سیاست اور دربار سے دور رہنے کی ہدایت کرتے تھے لیکن ان کے مریدوں میں ایک امیر خسرو ہی ایسے شخص تھے جنھیں اس بات کی آزادی حاصل تھی کہ وہ دربار سے بھی اپنا تعلق رکھ سکتے تھے۔ خواجہ سے امیر خسرو کو جو ارادت تھی اس کا بیان تمام تذکروں میں ملتا ہے اور خود ان کے کلام سے بھی ظاہر ہے مگر خسرو نے خواجہ سے کب بیعت کی اور بیعت کرتے وقت ان کی عمر کیا تھی۔ اس کے متعلق اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ شبلی کا خیال ہے کہ جب خسرو بچے تھے تبھی ان کے والد نے ان کو خواجہ سے بیعت کرادی تھی، چنانچہ وہ لکھتے ہیں :

"ان کے والد نے ان کو آٹھ برس کی عمر میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے قدموں پر ڈال دیا تھا اور برکت کے لیے بیعت کرادی تھی، خواجہ صاحب کی روحانی تاثیر چپکے چپکے اپنا کام کرتی جاتی تھی، امیر خسرو کی طبیعت میں عشق کا مادہ بھی ازلی تھا۔ وہ سر تاپا عشق تھے، اور یہ بجلی ان کی رگ رگ میں کوندتی پھرتی تھی ....(۲)"

---

(۱) از برنی (ص ۳۴۳ و ما بعد) (۲) شعر العجم دوسری جلد (ص ۱۲۸)

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے دیوان تحفۃ الصغر کے دیباچے سے خسرو کا مندرجہ ذیل بیان نقل کیا ہے:

"میں نے بارہ برس کی عمر میں بیت و رباعی کہنی شروع کی (۱)"

اسی صفحے میں آگے چل کر پروفیسر نظامی لکھتے ہیں:

"اس عمر میں شعر ایسے ترنم سے پڑھتے تھے کہ سننے والوں کی آنکھیں بے اختیار پرنم ہو جاتی تھیں۔۔۔ اسی ابتدائی دور میں جبکہ ان کی صلاحیتیں ابلی پڑ رہی تھیں اور کسی مرکز عقیدت کی تلاش میں بے چین تھیں جہاں ان کی شخصیت کو ایک رخ اوران کے افکار کو ایک رہبر مل جائے۔ وہ حضرت شیخ نظام الدین اولیا کے چشمۂ فیض پر پہنچے اور بقول خود ایسا محسوس کیا کہ:

مردہ بسر چشمۂ حیواں رسید۔

شیخ نے پہلی ہی نظر میں ان کے دل کی دھڑکنوں اور صلاحیتوں کی پکار کو سن لیا اور اس انداز سے تربیت کی کہ خسرو کی شخصیت کے سارے جوہر نکھر کر سامنے آگیے (۲)

ایک عجیب بات یہ ہے کہ شبلی نعمانی ہی کے مذکورہ بیان کو بیشتر مصنفین اور مورخین نے نقل کیا ہے اور اسی بنیاد پر یہ رایے قایم کی ہے کہ بچپن ہی میں خواجہ سے خسرو کی بیعت کرادی گئی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے بھی شبلی ہی کی بنیاد پر اپنی رایے قایم کی ہے کہ ابتدائی دور ہی میں خسرو نے خواجہ کے چشمۂ فیض سے استفادہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن پروفیسر وحید مرزا نے شبلی نعمانی کی تردید کی ہے کہ خسرو کے والد نے ان کو بچپن میں خواجہ سے بیعت نہیں کرایا تھا بلکہ وہ خود پہلی بار سلطان علاؤالدین خلجی کے عہد میں خواجہ کے آستانے پر حاضر ہوتے اور ان کے مقدس ہاتھوں پر باقاعدہ بیعت کی تھی۔ (۳)

---

(۱) شعر العجم دوسری حصہ (ص ۱۲۸) تاریخی مقالات (ص ۵۱)

(۲) ایضاً (ص ۵۱) (۳) امیر خسرو (ص ۱۶۱)

سلطان علاء الدین خلجی کا عہد حکومت امیر خسرو کی شہرت و عظمت کی بلندی کا دور تھا، یہی وہ زمانہ ہے جب انھوں نے اپنا تیسرا دیوان "غرۃ الکمال" مرتب کیا اسی بادشاہ کے ولیعہد اور گجرات کے حاکم شہزادہ خضر خاں کی فرمائش پر، دولرانی سے اس کے عشق کی داستان کو "دولرانی خضر خاں" کے نام سے نظم کیا اور حسن و عشق کے سچے واقعات و معاملات کو اپنے تخیل کی رنگینی اور پرکاری سے وہ رنگ دے دیا کہ یہ مثنوی "عشقیہ" کے نام سے آج تک مشہور ہے۔ خسرو نے مولانا نظامی گنجوی کے "خمسے" کے جواب میں اسی دور میں پانچ مثنویاں لکھیں جو "خمسۂ خسروی" کے نام سے جانی پہچانی جاتی ہیں۔ خمسۂ نظامی کا جواب خسرو سے پہلے کسی ایرانی یا ہندوستانی شاعر نے ایسی چابکدستی اور ایسی کامیابی کے ساتھ نہیں لکھا تھا، جیسا کہ انھوں نے لکھا اور اس "خمسے" کے ذریعے فارسی شاعری کی مملکت میں اپنی عظمت کا سکہ چلا دیا۔ خسرو نے اسی بادشاہ کی فتوحات اور نظام حکومت کے اصولوں پر مشتمل ایک کتاب "خزائن الفتوح" بھی لکھی جو فارسی نثر میں ان کی پہلی تصنیف ہے۔

ان سب باتوں کے باوجود ان کے کلام کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس بادشاہ کے عہد میں دماغ کی اس یکسوئی اور دل کے اس اطمینان سے محروم رہے جس کی اس وقت انھیں ضرورت تھی۔ پچھلے امیروں اور بادشاہوں نے خسرو کی بے حد قدردانی کی تھی اور ان کے ہر ہر شعر پر بے شمار سونا چاندی اور ہیرے جواہرات لٹائے تھے مگر علاء الدین کی حکومت کے زمانے میں وہ انعام و بخشش سے محروم رہے۔ ان کو وہی بارہ سو تنکے سالانہ ملتے تھے جو جلال الدین خلجی کے عہد میں ملا کرتے تھے اور ان کا منصب بھی "مصحف داری" کا رہا جو اب سے پہلے تھا۔ جبکہ اب پہلے سے زیادہ پابندی کے ساتھ دربار میں حاضری دینی پڑتی تھی اور امیرانہ فرائض کی انجام دہی کے لیے ہمہ تن اور ہمہ وقت تیار رہنا پڑتا تھا۔ اس کے باوجود بادشاہ ان کے موتیوں جیسے اشعار کے صلے میں کچھ نہیں دیتا تھا جس کی وجہ سے وہ مالی اعتبار سے بے حد پریشان رہا کرتے تھے۔

امیر خسرو نے اپنے بیشتر قصیدوں میں اپنی مفلوک الحالی کی طرف علاء الدین کی

توجہ دلائی اور اس کی جوشِ سخاوت کو للکارا اور ابھارا ہے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنگی مہموں، ملکی فتوحات اور انتظامی امور میں ایسا منہمک ، تھا کہ خسرو کے اشعار کی طرف خیال کرنے کی فرصت ہی اس کو نہ تھی۔ انھوں نے اپنی پریشانی حالی پر شکایت بھی کی ہے اور گذشتہ بادشاہوں کی داد و دہش اور سخاوت کا بیان کر کے بادشاہ کو فیاضی کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش بھی :

"کیسے افسوس کی بات ہے کہ آپ جیسا بادشاہ اور مجھ جیسا شاعر ایسی تنگی میں گذران کرے ۔ جو وظیفہ مجھے ملتا ہے وہ میرا حق ہے اور میری خدمت کا صلہ ہے اسلیے کہ میں ہمیشہ رکاب شاہی کے ہمراہ رہتا ہوں ۔ ۔ ۔ لیکن دل میں آپ کی ثنا خوانی کی خواہش ہے ، بغیر صلے کے یہ خواہش کیونکر پوری ہو سکتی ہے ؟ آپ اس بخشش و کرم سے ناواقف نہیں جو پچھلے بادشاہ شاعروں پر کیا کرتے تھے جو بعض دفعہ ایک قصیدے کے صلے میں یک گنج بخش دیتے تھے ۔ (۱)"

امیر خسرو اپنے عہد کے سب سے زیادہ ممتاز اور نامور شاعر تھے اور ان کے سارے مربیوں نے ان کا بہت پاس و لحاظ رکھا تھا، وہ اس عزت و منزلت اور فارغ البالی کے وہ عادی ہو چکے تھے، لیکن علاؤالدین نہ صرف بخشش و کرم کے معاملے میں بخل سے کام لیتا تھا بلکہ ان کو دربار میں حاضر رہنے پر بھی مجبور کرتا تھا، ظاہر ہے کہ یہ کام کسی بھی شاعر کے لیے گراں گذر سکتا ہے اور خسرو تو خسرو ہی تھے ، بھلا ان کو کیسے نہ تکلیف پہنچتی ۔ بادشاہ کو ہر طرح سے سخاوت اور صلہ و انعام کی ترغیب دلاتے دلاتے جب خسرو تھک کر نڈھال ہو جاتے ہیں اور اس پر ان کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا تو بلبلا اٹھتے ہیں اور کہتے ہیں :

"رات سے صبح تک اور صبح سے شام تک مجھے گوشۂ غم میں آرام کرنے کی ہمت نہیں ملتی، اپنے اس سرکش نفس کی وجہ سے اپنے جیسے ایک انسان کے سامنے کھڑا رہتا ہوں اور جب تک سر سے پاؤں تک پسینے میں نہ بھیگ جاؤں میرا ہاتھ کسی کے پانی سے تر نہیں ہوتا۔ (یعنی کوئی مجھے کھانا نہیں کھلاتا) ، جو مزدوری مجھے ملتی ہے اسے تو ننگ ـــ

---

(۱) مثنوی "عرض حال" جسے امیر خسرو اپنا شاہکار بتاتے ہیں۔ انڈیا آفس مخطوطہ نمبر ۱۱۸۷ (امیر خسرو ص ۴۵)

اپنا احسان سمجھتے ہیں اور جو محنت میں کرتا ہوں وہ سب بیکار محض سمجھی جاتی ہے۔ میرا حال اس

> گدھے کی طرح ہے جو کراتی مشقت اور رنج سے چارہ ڈھو کر لاتا ہے اور اسے تھوڑا سا جو کھانے کو دے دیے جاتے ہیں لیکن وہ بھی بہت ذلت کے ساتھ۔ اگر کبھی چند دن کے لیے مجھے اطمینان اور فراغت ملتی بھی ہے تو اتنی تنگ فرصت میں کیا یہ آسان بات ہے کہ کھودنے والا پتھر سے سونا کھود کر نکال سکے؟ (۱)

امیر خسرو جہاں عہد علائی میں بادشاہ کی بے اعتنائیوں کی وجہ سے پریشان حال رہے وہیں ان کو اسی زمانے میں دو جانکاہ صدموں سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ ان کی والدہ جن سے ان کو دنیا میں سب سے زیادہ محبت تھی اور چھوٹے بھائی حسام الدین قتلغ جو ان کے قوت بازو تھے، ان دونوں کا انتقال بھی اسی زمانے میں ہوا تھا، چنانچہ دربار میں وہ اپنی عزت نفس کو پامال ہوتا ہوا محسوس کرتے اور گھر میں بھی ماں کے مرجانے سے دل کا سکون و اطمینان نہ مل سکتا تھا۔ ایسی کس مپرسی کی حالت میں ان کو کسی ایسے شخص کی محبت اور ہمدردی کی ضرورت تھی جو ان کو تسلی دے سکتا ہو اور ان کے درد و غم کی ابلتی ہوئی موجوں کو ایک نیا موڑ بھی۔ ان دنوں ان کا دل درد کا خزانہ بنا ہوا تھا اور اس درد کی دولت نایاب کو کوئی خدا رسیدہ شخص ہی کامیاب طور پر استعمال کر سکتا تھا۔ چنانچہ دربار سے بیزار اور دنیا سے مایوس ہو کر خسرو نے خواجہ نظام الدین کے دامن بیکس پناہ کے سایے تلے پناہ ڈھونڈنی چاہی، کیونکہ وہ خواجہ سے بچپن سے واقف تھے اور خواجہ بھی ان کے کلام کے درد و سوز کی لذت کو محسوس کرتے تھے اور درد کی یہی لذت آشنائی تھی کہ انھوں نے خسرو کو اپنے آستانے پر کھینچ لیا اور خسرو بھی کشاں کشاں چلے آیے:

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

جب امیر خسرو نے خواجہ نظام الدین سے بیعت کرنے کا ارادہ کیا اور ان کے آستانے پر آیے تو خواجہ پر یہ بات روشن ہو گئی۔ انھوں نے اپنے خادم سے کہا کہ ایک ترک مجھ سے ملنے

---

(۱) ماخوذ از امیر خسرو مولفہ وحید مرزا (ص ۱۵۱)

آیا ہے، اسے اندر بلاؤ، خادم نے خسرو کو اندر بلایا اور جب وہ خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے ان کے ساتھ بے حد لطف و کرم اور نوازش کا برتاؤ کیا اور بیعت لیکر چار کونے والی ترکی ٹوپی جوان کے سلسلے کی نشانی تھی، عطا کی اور خسرو نے بھی اپنا سارا مال و اسباب خدا کے نام پر لٹا دیا۔

خواجہ نظام الدین کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے قبل خسرو کو دربار کی رنگینیوں اور دلفریبی میں زیادہ کشش محسوس ہوتی تھی اور وہ دنیاوی مال و متاع کی ہوس اور صلہ وانعام کی خواہش میں بادشاہوں اور امیروں کی مدح میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے تھے۔ وہ سفر سے بہت گھبراتے اور دہلی کو ایک لمحے کے لیے بھی چھوڑنا ان کو گوارہ نہ تھا مگر اس کے باوجود محض اپنے مربیوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے انھوں نے لکھنوتی، اودھ اور دکن کا بھی سفر کیا اگر شبلی کے اس بیان کو درست مان لیا جائے کہ خسرو کے دادا نے برکت کے لیے آٹھ سال ہی کی عمر میں ان کو خواجہ سے بیعت کرا دیا تھا اور :

"خواجہ صاحب کی تاثیر چپکے چپکے اپنا کام کرتی جاتی تھی"

تو یہ ناممکن تھا کہ خسرو کو دنیا اور معاملات دنیا سے اس قدر دلچسپی اور لگاؤ ہوتا، جیسا کہ ان کے قصیدوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ خسرو جو بیعت کرنے کے بعد سارا دن دربار میں گذار کر شام کو خواجہ کی خانقاہ میں آجاتے تھے اور حجرے پر پائنتی بیٹھ کر دن بھر کے قصے سنایا کرتے تھے، یقیناً انھوں نے بچپن میں بیعت نہیں کی تھی ورنہ خواجہ کی روحانی تاثیر ان کے کردار پر ضرور مرتب ہوتی اور وہ ہرگز ہرگز اپنی عزت نفس کو بادشاہوں کی خوشامد سے ذلیل نہیں کرتے۔ یہ تو ممکن تھا کہ وہ دربار سے وابستگی قائم رکھتے مگر یہ ممکن نہ تھا کہ خواجہ کے چہیتے مرید ہو کر صلہ وانعام کے لیے شیخ کے نام کو بٹا لگاتے، کیونکہ بقول پروفیسر خلیق احمد نظامی :

"حضرت محبوب الٰہی کی تعلیم و تربیت کا ایک اہم نکتہ یہ تھا کہ وہ کسی کی شخصیت کو دبا کر یا اس کی حقیقی صلاحیتوں کو پامال کر کے تربیت نہیں دیتے تھے۔ وہ فکر و عمل کے سرچشموں کو متاثر کرنے کے بعد خداداد صلاحیتوں کو خود ان کے رخ پر چلنے دیتے

تھے کہ انسانی شخصیت اسی طرح اپنے فن کو لیج سکتی ہے (۱)۔

خسرو کے بچپن میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا اور جب جوان ہوئے تو مہربان نانا بھی داغ مفارقت دے گئے۔ باپ اور نانا کی موت کے بعد وہ ماں کی غیر معمولی محبت کے سہارے زندہ رہتے تھے کہ ایک دن وہ بھی ان کو تنہا چھوڑ کر چلی گئیں اور چھوٹے بھائی بھی دنیا سے رحلت کر گئے۔ خسرو کی زندگی میں امارت اور تمام تر درباری شان کے باوجود رنج وغم کی دولت در آئی تھی۔ وہ بچپن سے جوانی اور پھر عمر کی منزل تک "درد" ہی سے دوچار رہے تھے اور یہ درد علاء الدین کی بے اعتنائی اور اپنی عزت نفس کی پامالی کے احساس سے اور بھی بڑھ گیا تھا۔ قصیدوں میں تو نہیں لیکن غزلوں میں اس درد لازوال نے اپنا کرشمہ خوب دکھایا ہے۔ خسرو کی غزلوں میں سوز و گداز، بے قراری، اضطراب اور تڑپ کی جو چاشنی محسوس ہوتی ہے، وہ اسی درد کا اعجاز ہے جو ان کی رگ رگ میں بجلی کی طرح کوندا پھرتا تھا، اور دل سے موج بن کر اٹھتا تھا، مگر درد کی یہ موجیں اپنا کرشمہ دکھانے کے لیے خواجہ نظام الدین کی رہبری اور رہنمائی کی منتظر تھیں۔

خواجہ نظام الدین اور امیر خسرو کی زندگی میں جو ایک بات مشترک تھی، وہ یہ تھی کہ دونوں بچپن میں یتیم ہو گئے تھے، اور ماں ہی کی آغوش تربیت میں پلے بڑھے تھے اور دونوں کی شخصیت کی تعمیر میں ان کی ماؤں ہی کا اہم ترین کردار تھا، چنانچہ دونوں یتیمی کے درد سے آشنا تھے اور اسی لیے خواجہ کو خسرو کے درد کو جاننے اور پہچاننے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی اور یہی وجہ تھی کہ:

"شیخ نے پہلی ہی نظر میں ان کے دل کی دھڑکنوں اور صلاحیتوں کی پکار کو سن لیا اور اس انداز سے تربیت کی کہ خسرو کی شخصیت کے سارے جوہر نکھر کر سامنے آ گئے (۱)"

چنانچہ ایک دن خواجہ نظام الدین نے فرمایا:

"خسرو اصفہانیوں کے طرز پر کوئی غزل لکھو جس میں عاشقانہ اور درد انگیز اشعار ہوں اور زلف اور خال کا ذکر ہو۔ (سیر الاولیا)

---

(۱) تاریخی مقالات (ص ۵۴) (۲) ایضاً (ص ۵۱)

خسرو کی مفید صلاحیتوں کے لیے یہ آزادی کا شعور تھا۔ اپنی طبیعت کے تقاضوں پر جو مصنوعی بندھ باندھنے کی کوشش کر رہے تھے، حضرت شیخ نے ایک جملہ میں توڑ دیے۔ میر خورد کا بیان ہے کہ اس فرمان کے بعد امیر خسرو معشوقوں کے زلف و خال اور استعارات و کنایات کی دنیا میں غرق ہو گئے اور ان دل آویز صفات کو انتہائے کمال پر پہونچا دیا۔[۱]

امیر خسرو کی شخصیت ہمہ گیر، ہمہ جہت اور ہمہ رنگ تھی۔ گذشتہ سات سو سال کی مدت میں ہندوستان کی خاک سے کوئی بھی ایسا شخص نہیں پیدا ہوا جو ان کی جیسی گوناگوں صلاحیت کا مالک اور جامع کمالات بھی ہو۔ وہ شاعر تو تھے ہی، مگر اس کے علاوہ ادیب بھی تھے، موسیقی کے ماہر بھی تھے، عالم بھی تھے، فاضل بھی تھے، مطرب بھی تھے، شاہی دربار میں امارت کا عہدہ بھی رکھتے تھے اور بوریا نشین فقیر بھی تھے۔ خسرو کے روحانی پیشوا خواجہ نظام الدین کا اصول تھا کہ وہ اپنے مریدوں کو ملکی سیاست اور شاہی دربار سے تعلق رکھنے سے روک دیتے تھے، کیونکہ اس سے معرفت و حقیقت کے مدارج طے کرنے میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ لیکن انھوں نے خسرو کو درباری زندگی سے باز نہیں رکھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کے ابھرنے کے لیے اس میدان کو ضروری سمجھتے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ اب چونکہ خسرو کے درد کو صحیح رخ مل گیا ہے اس لیے وہ دنیاوی آلودگیوں میں مبتلا نہیں ہو سکتے۔

چشتیہ سلسلے میں درد کی بڑی عظمت و اہمیت ہے۔ ہر شیخ اپنے مریدوں میں درد کی ہی چنگاری سلگانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آج چند خود غرض اور خود ساختہ علما و مشایخ نے ہر چیز کی صورت مسخ کر دی ہے لیکن خسرو کے معاصر مشایخ اپنے سلسلے سے وابستہ افراد کے دلوں میں درد و عشق کے اسی شرارے کو روشن کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ خسرو کے سینے میں پہلے ہی سے درد و عشق کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں، بس ذرا سے ہوا دینے کی دیر تھی اور یہ کام خواجہ نظام الدین کی نگاہ باصفا نے ایسا کیا کہ خسرو پکار اٹھے

کافر عشقم مسلمانی مرا در کار نیست
ہر رگ من تار گشتہ حاجت زنار نیست

---

(۱) تاریخی مقالات د ص ۵۲)

امیرخسرو کو خواجہ سے جو ارادت تھی وہ عشق کے درجے کو پہنچ گئی تھی اور خواجہ بھی ان کو اپنے سارے مریدوں میں سب سے زیادہ چاہتے تھے۔ عشا کی نماز کے بعد جب خواجہ اپنے حجرے میں چلے جاتے تو کسی کو بھی ان سے ملنے کی اجازت نہیں تھی لیکن اس خلوت خانے میں اگر کوئی خواجہ کا ہمراز و ہمعصیت تھا تو وہ صرف خسرو تھے۔ جب خواجہ کسی سے ناراض ہو جاتے اور کسی طرح کوئی عذر قبول نہیں کرتے تو خسرو ہی کی سفارش سے اس کی معافی ہوتی تھی۔

خواجہ اکثر فرمایا کرتے تھے :

"میں اور سب سے اکتا جاتا ہوں لیکن خسرو سے کبھی نہیں اکتاتا ——— قیامت کے روز یہی پر امید ہے کہ اس ترک کے دل میں جو آگ سلگ رہی ہے اس کی گرمی سے میرا نامۂ اعمال پاک ہو جائے گا (۱)"

اور جب خواجہ دعا مانگتے تھے تو خسرو کی طرف اشارہ کر کے فرماتے تھے

"الٰہی! بہ سوز سینۂ این ترک مرا بہ بخش!"

خواجہ سے امیر خسرو کو وہی عشق تھا جو شمس تبریز سے مولانا رومی کو۔ مگر خسرو اور رومی کے عشق میں ایک فرق تھا اور وہ یہ کہ شمس تبریز نے رومی کو بس ایک جھلک دکھائی اور پھر زندگی بھر کے لیے ان کو اپنے عشق میں تڑپتا ہوا چھوڑ کر شہاب ثاقب کی طرح غائب ہو گئے، جبکہ بقول شبلی :

"خواجہ صاحب سے امیر کی ارادت اور عقیدت، عشق کے درجہ تک پہنچ گئی تھی ہر وقت ساتھ ساتھ رہتے تھے، اور گویا ان کا جمال دیکھ کر جیتے تھے .... (۲)"

مولانا جلال الدین رومی بڑے پایے کے عالم و فاضل اور بزرگ تھے اور شاعر بھی۔ ان کے کلام میں دماغی سوزش اور فکر کی کارفرمائی نہیں محسوس ہوتی بلکہ ہر شعر سے دل کے جذبات کا رس ٹپکتا ہے۔ ان کی مثنوی، قرآن کی شرح معلوم ہوتی ہے اور آج صدیاں

---

(۱) امیر خسرو از وحید مرزا (ص ۱۶۱) (۲) سوانح عمری دوسری جلد (ص ۴۸)

گذر جانے کے بعد بھی اس کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آسکا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان پر الہام ہوتا جا رہا ہے اور وہ شعر کہتے جا رہے ہیں۔ ان کی مثنوی کے متعلق فارسی کے تمام شعرا اور علما و فضلا کا اس بات پر اتفاق ہے کہ :

مثنویٔ معنویٔ مولوی

ہست قرآں در زبانِ پہلوی

اس مثنوی میں اور ان کی غزلوں میں جو سوز و گداز، بیساختگی، بے خودی اور وارفتگی پائی جاتی ہے، وہ سب شمس تبریز کے عشق کا فیضانِ کرم ہے، ورنہ ان کا سارا علم و فضل دھرا کا دھرا رہ جاتا، اور وہ بقول خود کچھ بھی نہ ہو پاتے :

مولوی ہرگز نہ شد مولائی روم

تا غلامِ شمس تبریزی نہ شد

شمس تبریزی سے ملاقات کے بعد ہی مولانا روم کی شاعری میں کرشمۂ عشق نے اپنا جلوہ دکھایا ہے۔ ان کے اشعار سے سوز و گداز کی وہ لہریں اٹھتی ہیں کہ سننے یا پڑھنے والا از خود رفتہ ہو جاتا ہے اور اس دنیا کی آلائشوں سے بے تعلق ہو کر خود کو کسی اور دنیا میں سمجھنے لگتا ہے۔ شمس تبریز سے ان کے عشق کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے اپنے دیوان کا نام ہی "دیوان شمس تبریزی" رکھ دیا اور اس طرح اپنے درد و سوز کا نذرانہ ان کی بارگاہ میں پیش کر دیا اور شرف قبولیت حاصل کر لیے۔

امیر خسرو کا بھی یہی حال تھا کہ خواجہ سے بیعت کر لینے کے بعد ان کی کوئی بھی نثری یا شعری تصنیف ایسی نہیں ملتی جس میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی بزرگی اور کرامت کا ذکر یا ان سے اپنی عقیدت کا اظہار نہ ہو۔ وہ مبارک شاہ خلجی کے ندیم تھے اور اس کے دربار میں امارت کا عہدہ رکھتے تھے اور بادشاہ بھی ان کی بڑی قدر و منزلت کرتا تھا۔ علاء الدین خلجی کے بعد خسرو کا یہی وہ ممدوح تھا جس نے ان کے منھ موتیوں سے بھر دیے اور انعام و صلہ و انعام کی جو بارش کی وہ عہد علائی کی سختیاں اور مشقتیں بھلا دینے کے لیے کافی تھی۔ مگر اب چونکہ وہ خواجہ کے روحانی تصرف کے زیر اثر تھے اس لیے صلہ و انعام کی خواہش

مردہ ہو چکی تھی اور وہ محض اپنے شعری ذوق کی تسکین کے لیے کہا کرتے تھے جس مبارک شاہ خلجی کی نوازشیں ان پر بے شمار تھیں وہی ان کے شیخ خواجہ نظام الدین سے بے پناہ مخاصمت رکھتا تھا اور ان کی تعریف میں ایک لفظ بھی کسی کی زبان سے سننے کا روادار نہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود جب خسرو نے اس کی فرمائش پر اپنی مشہور مثنوی "نہ سپہر" کی تصنیف کی تو احساسِ زیان اور جان کی پرواہ کیے بغیر پکار اٹھے

نوشتم آن دم کہ من زاعتقاد ضمیر
گرفتم بحق دست آن دستگیر

نہ بہر از آنجا مرا راہ شد
کہ کشتی مرا دست آن شہ شد

من روی لعاب دہن یافتم
کزین گونہ آب سخن یافتم

زلالم کہ خضر آب جوی ویست
بدان زندہ ام چون ز جوی ویست

آٹھواں باب

امیر خسرو کی تصانیف

امیر خسرو کی شعری و نثری تصنیفات کی تعداد کا صحیح
تعین کرنا ایک مشکل امر ہے، کیونکہ جتنے تذکرے ہیں اتنے ہی اس کے
متعلق بیانات بھی ہیں کسی نے یہ لکھا ہے کہ ان کی تصانیف اتنی تھیں
کہ ان سے ایک کتب خانہ بن سکتا تھا (۱) کسی نے تصانیف کی تعداد ننانوے
بتائی ہے (۲) اور کسی نے اس پر مزید اضافہ کرکے ایک سو ننانوے بھی لکھا ہے (۳)
اور انھیں تینوں متضاد بیانات کو مختلف تذکرہ نویسوں نے نقل بھی کیا ہے۔
یہی وجہ تھی کہ نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی اور علی گڑھ کالج کے سکریٹری نواب محمد اسحاق خاں نے بیسویں صدی کی دوسری
دہائی میں خسرو کی تصانیف کا سراغ لگانا شروع کیا، اور اس کام کے لئے
انھوں نے نہ صرف یورپ، ترکی، مصر اور ہندوستان کے تمام کتب خانوں

---

(۱) ضیاء الدین برنی (۲) میر خورد (۳) نفحات الانس، گلزار ابراہیم، آتشکدہ

کی فہرست کا مطالعہ کیا، بلکہ برصغیر ہند کے اردو اخبارات و رسائل میں اشتہارات دے دے کر نایاب اور کمیاب نسخوں کو ڈھونڈ نکالنے کی بھرپور جد و جہد بھی کی... مسلسل کوشش اور لگن کے نتیجے میں ان کو جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے وہ مندرجہ ذیل ہیں (۱):

(۱) دیوان تحفۃ الصغر (۲) دیوان وسط الحیوۃ (۳) دیوان غرۃ الکمال (۴) دیباچہ غرۃ الکمال (۵) دیوان بقیہ نقیہ (۶) دیوان نہایۃ الکمال (۷) مطلع الانوار (۸) شیریں و خسرو (۹) مجنوں و لیلیٰ (۱۰) ہشت بہشت (۱۱) آئینہ اسکندری (۱۲) قران السعدین (۱۳) دول رانی خضر خاں یا عشیقیہ (۱۴) نہ سپہر (۱۵) مفتاح الفتوح (۱۶) مجموعۂ مثنویات (۱۷) مجموعۂ رباعیات (۱۸) کلیات (۱۹) قصیدۂ امیر خسرو مشتمل بر داستان شاہنامہ (۲۰) اعجاز خسروی (۲۱) انشائے خسرو (۲۲) احوال امیر خسرو (۲۳) خزائن الفتوح (۲۴) نصاب بدیع العجائب و نصاب مثلث (۲۵) افضل الفوائد (۲۶) خالق باری (۲۷) قصۂ چہار درویش (۲۸) بازنامہ (۲۹) فرس نامہ یا اسپ نامہ (۳۰) بحر العبر (۳۱) مرآت الصفا (۳۲) شہر آشوب یا مجموعۂ رباعیات (۳۳) تغلق نامہ (۳۴) تاج الفتوح (۳۵) تاریخ دہلی (۳۶) مناقب ہند (۳۷) حالات کنھیا و کرشن (۳۸) مکتوبات امیر خسرو (۳۹) جواہر البحر (۴۰) مقدمہ تاریخ الخلفا (۴۱) رسالۂ ابیات بحث: خسرو و جامی (۴۲) راحتہ المحبین (۴۳) شگوفہ بیان (۴۴) ترانہ ہندی (۴۵) مناجات خسرو۔

مذکورہ بالا کتابوں میں سے باز نامہ، اسپ نامہ، بحر العبر اور مرآت الصفا کے متعلق نواب محمد اسحاق خاں کا یہ خیال ہے کہ یہ چاروں مستقل تصنیف نہیں بلکہ بعض تصانیف کا جزو ہیں اور نمبر انتالیس سے لے کر نمبر پینتالیس تک کی کتابوں کے متعلق یہ بھی معلوم

---

(۱) امین رازی

ہو سکا کہ کبھی ہندوستان میں موجود بھی تھیں (۱) دیوان غرۃ الکمال اور دیباچۂ غرۃ الکمال دراصل ایک ہی تصنیف ہیں اور پروفیسر وحید مرزا کی تحقیق کے مطابق مجموعۂ مثنویات، مجموعۂ رباعیات اور کلیات خسرو کے کلام کے انتخابات ہیں، قصیدۂ امیر خسرو مشتمل بر داستان شاہنامہ، انشائے خسرو اور قصۂ چہار درویش فارسی خسرو کی تصانیف نہیں ہیں اور خالق باری کا بھی خسرو کی تصنیف ہونا مشتبہ ہے۔ نواب محمد اسحٰق خاں کے بیان اور اپنی تحقیق کی بنیاد پر پروفیسر وحید مرزا نے جو نتیجہ نکالا ہے، وہ یہ ہے:

"اس طرح صرف اکیس[۲] تصانیف ایسی رہ جاتی ہیں جو یقین کے ساتھ خسرو کی طرف منسوب کی جاسکتی ہیں اور یہ سب کی سب اس وقت موجود ہیں (۳)"

امیر خسرو کی تصانیف کی قدر و قیمت صرف علمی و ادبی لحاظ ہی سے نہیں بلکہ تاریخی نقطۂ نظر سے بھی بہت غیر معمولی ہے، کیونکہ انھوں نے اپنی شاعری میں اپنے عہد کی سیاسی، سماجی، معاشی، مذہبی، درباری اور عوامی زندگی کی روح پیش کر دی ہے۔ اور بقول پروفیسر خلیق احمد نظامی:

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ امیر خسرو کی تصانیف ہمارے تاریخی ورثہ کا بہترین سرمایہ اور قرون وسطیٰ کی تہذیب کی بہترین آئینہ دار ہیں۔ عہد حاضر کا مورخ جب ہندی قرون وسطیٰ کی تہذیب اور اس کے جلوۂ صد رنگ کا جائزہ لیا جاتا ہے تو اس کو اپنی معلومات کا سب سے بڑا سرچشمہ امیر خسرو کی تصانیف میں نظر آتا ہے، انھوں نے اپنی ان مثنویوں میں بھی جن کا بظاہر ہندوستان سے کوئی تعلق نہیں ہے، ہندوستانی تہذیب کے رنگ دلوں سے اپنے مرقعے تیار کیے ہیں۔ اس عہد کی روح، جس کو سمجھے بغیر تاریخی عوامل کا تجزیہ ممکن نہیں، ان کی تصانیف کے ہر صفحہ پر متحرک نظر آتی ہے (۳"

---

(۱) وحید مرزا (۲) امیر خسرو مولفہ وحید مرزا

(۳) ماہنامہ "آجکل" امیر خسرو نمبر نومبر ۱۹۷۴ء

چنانچہ امیر خسرو کی وہ کتابیں جو نہ صرف دنیا کے بیشتر کتب خانوں میں دستیاب ہیں بلکہ ایک عرصۂ دراز سے مورخین کا تختۂ مشق بھی بنی رہی ہیں، اب مختصر تعارف کے ساتھ پیش کی جاتی ہیں۔

(الف) دواوین

(۱) **تحفۃ الصغر** امیر خسرو کا پہلا دیوان ہے جس میں ۱۶ سال سے ۱۹ سال تک کی عمر کا کلام شامل ہے چونکہ ابتدائے جوانی میں انھوں نے خاقانی، انوری اور سنائی جیسے اساتذہ کے رنگ میں شعر کہنے کی کوشش کی تھی، اس لیے وہ خود اپنے اس دور کے کلام سے مطمئن نہیں تھے اور نہ ہی اسے مرتب کرنا چاہتے تھے۔ لیکن آخر کار ان کو اپنے دوست تاج الدین زاہد کے اصرار اور ہمت افزائی کی وجہ سے اس کلام کو ترتیب دینا ہی پڑا جس میں مختلف اساتذۂ فن کا رنگ جھلکتا ہے اور اس طرح ان کے شعری سرمایے کا ایک قیمتی حصہ ضائع ہونے سے بچ گیا۔ انھوں نے اس دیوان کے آغاز میں ایک دیباچہ بھی لکھا ہے جس سے ان کی ابتدائی زندگی کے گوناگوں اور دلچسپ حالات و واقعات معلوم ہوتے ہیں۔

تحفۃ الصغر میں ۳۵ قصاید، ۵ ترجیع و ترکیب بند، ایک مختصر مثنوی اور متعدد چھوٹے بڑے قطعات ہیں، اس میں بیشتر قصیدے سلطان غیاث الدین بلبن اور اس کے بڑے بیٹے شہزادہ محمد خاں کی مدح میں اور بقیہ قصاید امیر علی سرجاندار کشلو خاں، قوام الملک اور عزیز الدین وغیرہ امرا کے نام ہیں۔ ان قصیدوں سے بلبنی عہد کے امرا کے حالات زندگی اور اس عہد کے سیاسی و سماجی حالات کی ترتیب میں بڑی مدد ملتی ہے۔ علاوہ ازیں ایک ترکیب بند میں دو پرندوں کا مرثیہ ہے اور ایک میں نواب عماد الملک کا بہت ہی درد انگیز مرثیہ ہے جو خسرو کے نانا تھے۔

(۲) **وسط الحیوٰۃ** بھی خسرو کے دوستوں ہی کے اصرار پر مرتب کیا گیا تھا اور اس میں ان کے ۱۹ سال سے ۳۴ سال کی عمر تک کا کلام ہے۔ یہ دیوان اس دور سے متعلق ہے جب ان کی شاعری اپنے شباب کے نقطۂ عروج پر تھی۔ اس کے ہر ہر شعر سے طبیعت کی جولانی اور جوش و ولولہ ظاہر ہوتا ہے مگر اس میں وہ متانت اور پختگی نہیں جو اس کے بعد کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ اس کے دیباچے سے بھی ان کی زندگی کے حالات و واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔

وسط الحیوٰۃ میں ۵۸ قصیدے، ۸ ترجیع بند اور متعدد قطعات و رباعیات ہیں اس میں جو قصاید شامل ہیں ان کا تاریخی مواد تیرھویں صدی عیسوی کی ہندوستانی تاریخ کی ترتیب و تدوین کے لیے ایک بیش بہا خزانہ ہے۔ اس میں مغلوں کے مسلسل حملوں اور شہزادہ محمد کی شہادت اور لکھنوتی میں طغرل کی شکست کے تفصیلی حالات موجود ہیں۔

(۳) **غرۃ الکمال** اس کلام پر مشتمل ہے جو ۳۴ سال سے ۴۳ سال کی عمر تک کہا گیا تھا لیکن بعد میں اس میں کچھ اور بھی اضافہ ہوا ہے۔ یہ خسرو کے پانچوں دیوان میں سب سے زیادہ ضخیم ہے اور اس میں ان کے کلام کے بہترین نمونے موجود ہیں اس میں ۹۰ سے زاید قصیدے، خان شہید کا مرثیہ، ۹ مثنویاں، قطعات، رباعیات اور غزلیں بھی شامل ہیں۔ یہ دیوان سیاسی، معاشرتی، اقتصادی، مذہبی، تاریخی اور علمی و ادبی نقطۂ نظر سے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔

غرۃ الکمال کے قصاید میں خلجی بادشاہوں اور شہزادوں مثلاً ارکلیک خاں بالماس بیگ اور الغ خاں کے بعض دلچسپ حالات موجود ہیں، علاءالدین خلجی کے ایک بیٹے کی پیدایش پر خسرو کا لکھا ہوا وہ قصیدہ بھی اسی میں شامل ہے جس میں دہلی کی زینت و آرایش اور وہاں کی تمدنی زندگی کی ایک دلکش تصویر پیش کی گئی ہے۔ اس دیوان کا دیباچہ اس کے کلام سے زیادہ اہم ہے کیونکہ اس میں خسرو نے اپنی زندگی کے مختصر حالات

بیان کرتے ہوے اس زمانے کے شعری وادبی رجحانات کی طرف بھی اشارے کیے ہیں۔

اس دیباچے میں انھوں نے جن موضوعات پر بحث چھیڑی ہے وہ یہ ہیں :

شاعری کی خوبیاں کیا ہیں ؟ فارسی شاعری کو کس بنا پر عربی شاعری پر ترجیح دی جاسکتی ہے ؟ شعر کی اقسام کتنی ہیں ؟ ہندوستان کی فارسی شاعری کو کیوں امتیاز حاصل ہے ؟ اور شاعری میں کن طریقوں سے مہارت پیدا کی جاسکتی ہے ؟ وغیرہ وغیرہ۔

(۴) بقیہ نقیہ

میں علاء الدین خلجی کے انتقال کے بعد کا کلام شامل ہے۔ اس میں ۴۲ قصیدے، ۶ ترجیعات، ۲۰۰ قطعات، ۵۷۰ غزلیں ۲۶۰ رباعیات اور مثنوی کے ۱۹۵ بیت ہیں۔ اس کے قصاید قطب الدین خلجی، الماس بیگ اور تاج الدین دبیر وغیرہ کی مدح میں ہیں اور حسنِ ادا اور زورِ تخیل میں غرۃ الکمال سے بھی بازی لے گئے ہیں۔ مگر اس کا دیباچہ غرۃ الکمال سے چھوٹا ہے۔ اس دیوان میں رمضان اور عید پر بھی نظمیں شامل ہیں جن میں اس دور کی مذہبی زندگی کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ بقیہ نقیہ میں نسبتاً پختہ کلام کے نادر نمونے ملتے ہیں۔

(۵) نہایت الکمال

کو خسرو نے محمد تغلق کی تخت نشینی کے بعد اور اپنی وفات سے کچھ پہلے مرتب کیا تھا۔ اس کا دیباچہ مقفیٰ اور مرصع عبارت میں ہے اور اس میں حمد و نعت کے بعد خواجہ نظام الدین اولیا کے مناقب ہیں۔ اس میں ۲۲ قصیدے ہیں جو غیاث الدین تغلق اور محمد بن تغلق کی مدح میں لکھے گیے ہیں، ۵ ترجیع بند اور ۴ چھوٹی چھوٹی مثنویاں ہیں۔ علاوہ ازیں متعدد قطعات رباعیات اور غزلیں بھی اس میں شامل ہیں جن میں سے بعض غزلیں پہلے دواوین ہی کی ہیں چار قصاید میں اخلاق و تصوف کے مسایل بھی پیش کیے گیے ہیں۔

نہایت الکمال میں ایک مثنوی "در تعریف تغلق آباد" ہے جس میں دور تغلق کی نئی آبادی کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثنوی "صحیفۃ الاوصاف" تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے کیونکہ محمد تغلق جب شہزادہ تھا وہ دیوگر کی مہم پر بھیجا گیا تھا۔ اس وقت دیوگر کا نام قطب آباد تھا۔ امیر خسرو بھی شہزادہ کے ساتھ گیے تھے، چنانچہ انھوں نے اس مثنوی

میں دیوگر کی آبادی، جغرافیائی خوبیوں اور موسم کا بیان بہت ہی دلکش پیرایے میں کیا ہے۔

(ب) تاریخی مثنویاں

(۱) **قِران السّعدین** مثنویوں میں خسرو کی پہلی مستقل تصنیف ہے جو معزالدین کیقباد کی فرمائش پر تین مہینے کی مسلسل کاوش اور گوشہ نشینی کے بعد ۶۸۸ ہجری کے رمضان میں مکمل کی گئی تھی۔ اس کی تصنیف اگرچہ مثنوی کے میدان میں خسرو کا پہلا قدم تھا اور موضوع بھی نہایت ناخوشگوار اور اذیت ناک تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ بحیثیت مجموعی اپنی کوشش میں کامیاب رہے ہیں۔

غیاث الدین بلبن کے انتقال کے وقت اس کا بیٹا بغرا خاں بنگال کا گورنر تھا اس لیے اس کے بیٹے کیقباد کو امراے دہلی نے تخت پر بٹھا دیا۔ اس واقعہ کے ردعمل میں بغرا خاں نے بنگال میں اپنی آزاد حکومت کا اعلان کر دیا اور نتیجہ کے طور پر باپ بیٹے کے درمیان جنگ کی نوبت پہنچ گئی۔ امیر خسرو اس موقع پر کیقباد کے ساتھ اودھ گیے اور بادشاہ کی دہلی واپسی کے بعد بھی وہ دو سال تک اس صوبے کے گورنر امیر علی سرجاندار کے ساتھ وہاں رہے تھے۔ جب وہ دہلی آیے تو کیقباد نے ان کو اپنا ندیم بنا لیا اور مذکورہ واقعہ پر مشتمل ایک مثنوی لکھنے کی فرمائش کی۔ یہ مثنوی ان کے ابتدائی زمانے کا کارنامہ ہے لیکن زبان و بیان کی خوبی، دہلی اور اودھ کے سماجی ماحول کی تصویر کشی میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔

قران السعدین پر یہ اعتراض ہے کہ اس میں اصل مضمون کے متعلق بہت کم لکھا گیا ہے۔ یہ درست ہے لیکن مسئلہ یہ درپیش تھا کہ اگر صرف اصل واقعہ ہی کو نظم کیا جاتا تو پھر یہ مثنوی قصہ کہانی سے آگے نہ بڑھ پاتی اور اس میں شاعرانہ حسن نہیں پیدا ہوتا۔ اس کے قصے کو نظر انداز کر کے اگر دیکھا جایے تو بعض حصے وصف نگاری کا بہترین نمونہ ہیں۔ دل و دماغ کو بوجھل بنا دینے والے واقعات کو دور کرنے کے

لیے اس میں جابجا ایسی غزلوں کا اضافہ بھی کیا گیا ہے جو سیاق و سباق سے مناسبت رکھتی ہیں۔ خسرو نے مثنوی کی تکمیل کے چار سال بعد اس میں کچھ اور اشعار کا اضافہ کیا تھا۔

اس کی تاریخی اہمیت کچھ بہت زیادہ نہیں ہے مگر معاشرتی مطالعہ کے نقطۂ نظر سے اس کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ بادشاہوں اور امرا کے تکلفات زندگی کی بہت سی دلچسپ اور مفید باتیں لکھی گئی ہیں۔ مثنوی میں بہت سی ایسی تفصیلات ہیں جن سے اس دور کے تہذیبی حالات پر روشنی پڑتی ہے مثلاً دہلی کی تمدنی حالت، جامع مسجد، قطب مینار، حوض شمسی، شہر نو اور قصر نو وغیرہ کا حال کسی دوسری تاریخ میں نہیں ملتا۔ شہری زینت و آرائش، رقص و سرود کی محفلیں، موسیقی کے آلات اور ان کشتیوں کا بیان بھی مثنوی میں ہے جن میں کیقباد اور بغرا خاں دریائے سرجو کے آر پار آتے جاتے تھے۔ یہیں اس بات کا علم قران السعدین ہی سے ہوتا ہے کہ کیقباد جیسے عیش و عشرت کے دلدادہ اور شاہد و شراب کے متوالے بادشاہ کو امیر خسرو نے بڑی جرأت اور بیباکی سے نصیحتیں کیں اور اس کے کردار کے مختلف پہلوؤں پر بھرپور تنقیدی وار کیا۔

(۲) مفتاح الفتوح

جلال الدین خلجی کے عہد میں ۲، جمادی الثانی ۶۹۰ ہجری میں مکمل ہوئی۔ یہ مثنوی سلطان مذکور کی فتوحات پر مشتمل اور بہت مختصر ہے اور دیوان غرۃ الکمال میں شامل کی گئی تھی۔ اس میں جلال الدین خلجی کی تخت نشینی اور ابتدائی مہمات کی وہ تفصیلات درج ہیں جو کسی اور معاصر تاریخ میں نہیں ملتیں۔ تاریخی نقطۂ نظر سے اس کی دو خصوصیات ہیں۔ ایک یہ کہ صنائع بدائع سے معرا ہے اور اس کی زبان میں سادگی بھی ہے، اور دوسرے یہ کہ تمام واقعات بلامبالغہ نظم کر دیے گیے ہیں۔ اس میں بادشاہ کی چار فتوحات یعنی ملک چھجو کی بغاوت اور سرکوبی، اودھ کی کامیابیاں، مغلوں کی سرزنش اور شکست اور جھاین کی فتح بیان کی گئی ہے۔

اس مثنوی میں خسرو کے لیے ایک مشکل مقام وہ آیا ہے جہاں ان کا پہلا محسن اور مربی ملک چھجو ایک باغی کی حیثیت سے زنجیروں میں جکڑا ہوا جلال الدین خلجی کے سامنے لایا گیا ہے۔ وہ اس کی مذمت کرنے پر آمادہ نہ تھے کیونکہ پرانی وفاداری

اور مروت آڑے آرہی تھی۔ اس لیے انھوں نے اس کو صرف ایک "بدعہد" کہنے پر اکتفا کیا اور اس کے آگے اپنا قلم روک لیا۔

(۳) دول رانی

خضر خاں، عشقیہ یا منشور شاہی ایک ہی تصنیف کے نام ہیں۔ ۷۱۵ ہجری میں مکمل ہوئی۔ یہ خسرو کی اور مثنویوں میں اس اعتبار سے خاص اہمیت رکھتی ہے کہ یہ حقیقت پر مبنی ہے اور اس کی بنیاد شاعرانہ تخیل سے زیادہ سچے واقعات پر ہے اس کا موضوع عشق و محبت ہے اور یہ قصہ ہندی کی تقریباً ہر تاریخ میں مذکور ہے۔ اس کا اسلوب مفتاح الفتوح سے مختلف اور قران السعدین سے مشابہ ہے۔ اس میں شاعرانہ بلند پروازی، صنایع بدایع، قوت تخیل اور محاکات اپنی آب و تاب کے ساتھ موجود ہیں۔

ایک روز خضر خاں نے امیر خسرو کو بلا کر دول رانی سے اپنے عشق کی داستان ان کو سنائی اور اس سے متعلق اپنا روزنامچہ بھی ان کو دے دیا تاکہ اس کو نظم میں منتقل کر دیں۔ انھوں نے اس کام کو بڑے خلوص اور تندہی سے انجام دیا اور ۷۱۵ ہجری میں یہ مثنوی مکمل ہو گئی۔ لیکن بعد کو جب خضر خاں کو اندھا کر کے قلعہ میں قید اور پھر قتل کر دیا گیا تو اس سے وہ بہت متاثر ہوئے اور غیاث الدین تغلق کے زمانے میں ان واقعات کو بھی نظم کر کے شامل کیا۔ خسرو کو خضر خاں سے تعلق خاطر تھا شاید اس وجہ سے کہ وہ بھی خواجہ نظام الدین اولیا کا مرید تھا۔ بعد کا حصہ علاء الدین خلجی کی بیماری، ملک کافور کی احسان فراموشی، اور خضر خاں کے قتل کے واقعات پر مشتمل ہے۔ اس مثنوی میں خسرو نے علاء الدین خلجی کو بڑی بیباکی سے ظلم اور شراب نوشی کے بھیانک نتائج سے آگاہ کیا ہے اور ایک جگہ سلاطین دہلی کا فرداً فرداً ذکر کر کے ہر ایک کے متعلق ایسی رائے دی ہے جو اس کی سیرت اور کارناموں کا بہترین خلاصہ ہے۔

اس مثنوی میں معشوقانہ ناز و ادا، عاشقانہ نیازمندی، امید و بیم اور دو دلوں کی پنہاں تپش اور باہمی کشش کو بہت موثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں

عشقیہ داستان کے علاوہ جو تھوڑے بہت تاریخی واقعات ہیں وہ صحت مند ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان کے پھولوں پھلوں اور حسن ملیح والی دلکش عورتوں کا بیان اور وطن پرستی کا شدید جذبہ بھی نمایاں ہے۔ چھوٹی چھوٹی دلچسپ کہانیاں بھی ہیں اور فارسی میں ہندی الفاظ کا خوبصورت جوڑ بھی ہے۔ اور جا بجا غزل کے ٹکڑے اس مثنوی میں شامل ہیں جو عشقیہ داستان کی جاذبیت کو اور بھی بڑھا دیتے ہیں۔

(۴) نہ سپہر نہ صرف تاریخی حیثیت سے بلکہ معاشرتی نقطۂ نظر سے بھی ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ امیر خسرو نے اس مثنوی کو قطب الدین مبارک شاہ خلجی کی فرمائش پر لکھنا شروع کیا اور جمادی الاول ۷۱۸ ہجری میں پورا کیا۔ اس مثنوی کو انھوں نے ۹ حصوں میں تقسیم کیا ہے جن میں سے بعض بڑے ہیں اور بعض چھوٹے اور ہر ایک حصے کو ایک سپہر مانا ہے جو کسی نہ کسی ستارے سے متعلق ہے۔

اس مثنوی میں قطب الدین خلجی کی تخت نشینی، دیوگیر کی مہم، قصرِ نو کی تکمیل اور جامع مسجد کی تعمیر کے علاوہ دہلی سے متعلق ایک حصہ ہے جس میں دنیا کے مشہور شہروں سے دہلی کا مقابلہ کر کے اس کی برتری ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے، قدیم ہندوستان کے تہذیبی کارناموں کے ساتھ ساتھ یہاں کی آب و ہوا، پھول پھل، پرند چرند، مذہب، رسوم اور زبانوں کا ذکر بڑے اہتمام سے کیا گیا ہے۔ ایک باب میں امراء سلاطین کے لیے کچھ ایسی نصیحتیں بھی ہیں جن سے خسرو کے سیاسی افکار و نظریات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک شہزادے کی پیدائش پر شاہی محل میں جشن کی تفصیل ہے۔ گویا یہ ادبی قسم کے ادبیت سے ایسے واقعات درج ہیں جو ہندوستان کی تمدنی تاریخ سے متعلق نہایت اہم اور قابلِ قدر معلومات فراہم کرتی ہیں۔ باوجودیکہ قطب الدین خلجی کے تعلقات خواجہ نظام الدین اولیا سے بے حد کشیدہ تھے اور وہ ان کی شان میں کھلے عام گستاخانہ

الفاظ کہا کرتا تھا، امیر خسرو نے حمد و نعت کے بعد اور بادشاہ کی مدح سے پہلے اپنے پیر و مرشد کی منقبت بھی لکھی۔ اس سے ان کی جرأت، دلیری اور اپنے شیخ سے والہانہ عشق کا اندازہ ہوتا ہے۔

(۵) تغلق نامہ: خسرو کی تاریخی مثنویوں کے سلسلے کی آخری کڑی ہے جسے انھوں نے اپنے انتقال سے کچھ عرصہ پہلے تصنیف کیا تھا۔ اس مثنوی میں خسرو نے خلجیوں کی بربادی اور غیاث الدین تغلق کی تخت نشینی کے واقعات بیان کیے ہیں۔ غازی ملک (غیاث الدین تغلق) نے جن نامساعد حالات میں علم بغاوت بلند کرکے خاندان علائی کو نیست و نابود کر دینے کا بیڑا جس طرح خسرو خاں سے لیا۔ اس کی تفصیل اس مثنوی کے علاوہ اس عہد کی کسی اور تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس کا اسلوب بیان سیدھا سادہ ہے اور اگرچہ اس میں صنایع بدایع کا بھی استعمال ہوا ہے مگر اس کے باوجود وہ رنگ آمیزی اور شاعرانہ بلند پروازی نہیں ہے جو خسرو کی بعض اور تاریخی مثنویوں میں پائی جاتی ہیں ـــــ اس مثنوی کے بعد تاریخی مثنویوں کا وہ سلسلہ ختم ہو گیا جس کی ابتدا قران السعدین سے ہوئی تھی۔

(ج) خمسۂ خسروی

فارسی شاعری کی تاریخ میں مولانا نظامی گنجوی کے خمسے کو غیر معمولی شہرت و مقبولیت اور ادبی اہمیت حاصل ہے۔ اس میں پانچ مثنویاں ہیں جن کے نام یہ ہیں، مخزن الاسرار، خسرو شیریں، سکندر نامہ، مجنوں لیلیٰ اور ہفت پیکر ـــــ "خمسۂ نظامی" کا جواب بہت سے شعرا نے لکھا ہے مگر ناقدین فن کا یہ خیال ہے کہ امیر خسرو نے جو پانچ مثنویاں لکھیں وہ "خمسۂ خسرو" کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کی تصنیف اگرچہ کسی بادشاہ کی فرمائش پر نہیں ہوئی تھی لیکن یہ سب

کی سب علاءالدین خلجی کے نام سے معنون ہیں۔

امیر خسرو نے "خمسۂ نظامی" کی غیر معمولی شہرت و مقبولیت کے پیش نظر شاید اپنی شہرت میں مزید اضافہ کرنے کے لیے ہی اپنے خمسے کو لکھنا چاہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے بھی نظامی ہی کی مثنوی کی بحریں استعمال کی ہیں اور انھیں مضامین کو باندھا ہے جو "خمسۂ نظامی" سے متعلق ہیں۔ ابتدا میں جب ان کو خلاف توقع غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی تو شاعرانہ تعلّی میں وہ یہ کہہ اٹھے کہ

کوکبۂ خسرویم شد بلند
زلزلہ در گور نظامی فگند

لیکن نظامی سے آگے بازی لے جانا کچھ آسان کام نہ تھا۔ کچھ آگے چل کر نظامی کی ٹکر کا جواب لکھنے میں ان کو دشواری محسوس ہونے لگی۔ مگر چونکہ کسی کام کو ادھورا چھوڑ دینا ان کے مزاج کے خلاف تھا۔ اس لیے انھوں نے کسی طرح اس خمسے کو پورا کر لیا۔ پھر بھی یہ بات حیرت انگیز ضرور ہے کہ صرف تین سال کے مختصر عرصے میں اتنی طویل پانچ مثنویاں پوری ہو گئیں۔

کچھ لوگوں نے "خمسۂ خسرو" کو خمسۂ نظامی پر فوقیت دی ہے اور بعض نے سرے سے اس حقیقت ہی سے انکار کیا ہے کہ خسرو نے نظامی کی ٹکر کا جواب لکھا ہے۔ ناقدین فن کے یہ دونوں گروہ شاید مبالغہ کا شکار ہو گئے ہیں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ خسرو نے نظامی سے بہتر مثنویاں تو نہیں لکھیں لیکن ان کی کامیاب ترین تقلید ضرور کی ہے اور خمسے کے بعض حصے میں وہ یقیناً آگے بڑھ گئے ہیں۔ خمسۂ خسرو کی پانچوں مثنویاں یہ ہیں:

(۱) **مطلع الانوار**: کی تصنیف صرف دو ہفتے کی مدت میں ۶۹۸ ہجری میں ہوئی تھی۔ یہ نظامی کی مثنوی "مخزن الاسرار" کا جواب اور "خمسۂ خسرو" کے سلسلے کی پہلی مثنوی ہے۔ اس کا موضوع اخلاق

اور تصوف ہے۔ اس مثنوی کو خمسے کی تمام مثنویوں میں سب سے زیادہ شہرت ملی اور متعدد شاعروں نے اس کا بھی جواب لکھا۔ چنانچہ مولانا جامی کی مثنوی "تحفۃ الابرار" خسرو کی "مطلع الانوار" ہی کے جواب میں ہے۔

(۲) شیریں خسرو:- بھی ۶۹۸ ہجری ہی کے ماہ رجب المرجب میں لکھی گئی تھی۔ یہ نظامی کی دوسری مثنوی "خسرو شیریں" کے جواب میں ہے۔ جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے۔ اس کا موضوع عشق و محبت ہے۔ یہ مثنوی سرزمین ایران کے خسرو اور شیریں کی مشہور داستان عشق پر مشتمل ہے۔ اس میں سب عروس کے ہیجان انگیز بیان کے بعد علم و دانش کے نکات بھی بیان کیے گیے ہیں۔

(۳) لیلیٰ مجنوں:- بھی ۶۹۸ ہجری ہی میں لکھی گئی تھی۔ یہ نظامی کی مثنوی مجنوں لیلیٰ کا جواب ہے۔ خسرو کی والدہ اور ان کے بھائی حسام الدین قتلغ کا انتقال اسی سال ہوا تھا۔ چنانچہ اس مثنوی میں ان دونوں کا مرثیہ بھی ہے۔ یہ مثنوی سرزمین حجاز کے مشہور عشقیہ کردار مجنوں اور لیلیٰ کی داستان عشق پر مشتمل ہے۔ فنی لحاظ سے اس کا مرتبہ بہت بلند ہے کیونکہ اس میں واردات قلبی، عشق کے اسرار و رموز اور عاشق و معشوق کے ناز و نیاز پوری رنگینی اور سوز و گداز کے ساتھ بڑی مہارت سے بیان کیے گیے ہیں۔

(۴) آئینہ سکندری:- نظامی کے سکندر نامہ کا جواب ہے۔ یہ مثنوی ۶۹۹ ہجری میں تصنیف ہوئی تھی۔ یہ سکندر اعظم کی جنگی فتوحات کے واقعات پر مشتمل ہے۔ لیکن اس کا کردار سکندر اعظم دراصل سکندر ثانی یعنی علاءالدین خلجی کے انداز پر ڈھلا ہوا ہے۔ اس کی تفصیلات "سکندر نامہ" سے زیادہ ارض اور حقیقی ہیں۔

(۵) ہشت بہشت:- امیر خسرو کے خمسے کی آخری مثنوی اور

نظامی کی "ہفت پیکر" کا جواب ہے۔ یہ مثنوی ۷۰۱ ہجری میں تمام ہوئی تھی۔

خمسہ امیر خسرو کی پہلی اور آخری ایسی تصنیف ہے جس میں انھوں نے ایک استادِ فن کی کامیاب تقلید کے لیے اپنے مخصوص رنگ و آہنگ اور لب و لہجے کو پوری فراخ دلی سے قربان کر دیا ہے۔ یہ مثنویاں اگرچہ ہندوستان سے تعلق نہیں رکھتیں اور نہ ہی ان کی تاریخی حیثیت و اہمیت ہے مگر اس کے باوجود ان میں ہندوستانی تہذیب و معاشرت کی ایسی جھلکیاں نمایاں ہیں جن سے اس عہد کے ہندوستان کی روح تک پہنچنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

(د) نثری تصانیف

(۱) اعجاز خسروی پانچ رسالوں پر مشتمل ہے اور اسی لیے اس کا اصلی نام "رسائل الاعجاز" ہے۔ اس کے چار رسالے تو ۶۸۲ ہجری ہی میں مکمل ہو چکے تھے مگر پانچواں رسالہ ۷۱۹ ہجری میں شامل کیا گیا تھا۔ یہ آخری رسالہ زیادہ تر خسرو کے ان خطوط پر مشتمل ہے جو ابتدائی عمر میں لکھے گئے تھے۔ اسی لیے ان میں وہ پختگی اور روانی نہیں جو شروع کے چار رسالوں میں پائی جاتی ہے۔

یہ کتاب صرف ان کے خطوط کا مجموعہ ہی نہیں ہے بلکہ اس میں مختلف بادشاہوں کے مضامین بھی شامل ہیں۔ مولانا شہاب الدین کے نام دو پورے خطوط ہیں جن میں ایک عربی میں ہے اور دوسرا فارسی میں ہے۔ اس میں عربی و فارسی کی نئی امثال بھی درج ہیں۔ امیر خسرو نے ہندوستانی موسیقی اور نامور

موسیقاروں کے متعلق بھی لکھا ہے اور نجوم، طبیعات، طب، فقہ اور مختلف کھیلوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف مرصع و مزین نثر اور صنایع و بدایع کے استعمال کا بہترین نمونہ ہے بلکہ اس میں لغوی، نحوی، ادبی، تاریخی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے بے شمار معلومات بھی موجود ہیں۔ امیر خسرو نے اس عہد میں مروجہ فارسی کے نثر کے نو اسالیب کا ذکر کیا ہے۔ علاوہ ازیں انشا کے ایسے مختلف اسلوب بھی بیان کیے ہیں جو دوسروں کے لیے قابلِ تقلید رہے ہیں۔ خسرو نے جا بجا اپنی ظرافت طبع کا بھی کھل کر اظہار کیا ہے۔ غرضیکہ خسرو کی یہ نثری تصنیف بھی اس عہد کی تاریخی، سماجی اور علمی وادبی حالات و میلانات کا ایک اہم ترین خزانہ ہے۔

(۲) خزاین الفتوح :۔ کو امیر خسرو نے ۷۱۱ ہجری میں پورا کیا تھا۔ اس کا ایک اور نام "تاریخ علائی" بھی ہے کیونکہ یہ سلطان علاء الدین خلجی کی فتوحات اور انتظام حکومت کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں سلطان مذکور کے وہ واقعات مندرج ہیں جن کا تعلق ۶۹۵ سے ۷۱۱ ہجری تک سے ہے۔ اس طرح شمالی ہند کے علاوہ اس بادشاہ کی فتوحات دکن کے واقعات کے ساتھ ہی جنوبی ہندوستان کی تہذیب و معاشرت سے متعلق اس میں بہت سی معلومات فراہم ہیں ملتی ہیں۔ اس کی تصنیف دراصل نثر نگاری کے میدان میں خسرو کا پہلا قدم تھا۔ کیونکہ اس سے پہلے انھوں نے اگرچہ اپنے دواوین کے دیباچے لکھ کر نثر نگاری کی مشق کر لی تھی لیکن نثر میں ان کی یہ پہلی باضابطہ تصنیف ہے یہ کتاب خسرو ہی کی ایجاد کردہ اس نئے اسلوب تحریر میں ہے جس میں ایہام وخیال کا استعمال ہوتا ہے۔ خسرو بنیادی طور پر شاعر تھے اس لیے ان سے نثر میں سادگی کا مطالبہ فضول ہے۔ ان کی یہ کتاب اگرچہ تاریخی حالات و واقعات پر مشتمل ہے مگر ان کے پیش نظر تاریخ نویسی نہیں تھی وہ ادیب

ادیب تھے اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس میں ادبی زبان اور انداز بیان برتا اور اختیار کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود تاریخی واقعات کی صحت و ترتیب میں نقص نہیں ملتا۔ اس کی تاریخی اہمیت یوں بھی غیر معمولی ہے کہ علاؤالدین خلجی سے متعلق یہ واحد کتاب ہے جو اسی عہد میں لکھی گئی تھی۔

(۳) افضل الفواید:۔ خواجہ نظام الدین اولیا کے حالات و کوائف اور ملفوظات پر مشتمل امیر خسرو کی نثری تصنیف ہے۔ اس کا ایک حصہ انھوں نے ۷۱۹ ہجری میں خواجہ کو دکھایا تھا۔ جسے پڑھ کر وہ بے حد خوش ہوئے اور خسرو کی ہمت افزائی بھی کی تھی۔ اس کے بعد خسرو نے اس کا دوسرا حصہ لکھنا شروع کیا جو ناتمام رہ گیا۔ اس کی زبان بہت ہی سادہ و سلیس اور اس فارسی نثر کا نمونہ ہے جو اس عہد میں بولی جاتی تھی۔ چونکہ صوفیا کا مقصد دین کی تبلیغ اور خاص و عام کی ہدایت ہوتا تھا، اس لیے وہ لوگ اپنی گفتگو میں نہایت سادہ اور موثر زبان استعمال کرتے تھے۔ تاکہ ہر عالم و جاہل آسانی سے سمجھ سکے۔ خواجہ نظام الدین اولیا اپنی گفتگو میں جس سادہ و سلیس اور عام فہم زبان کو برتا کرتے تھے۔ خسرو نے افضل الفواید میں اسی زبان کو لکھنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ یہ ان کا اسلوب تحریر نہ تھا مگر اس کے باوجود وہ اپنے اس مقصد میں بہت حد تک کامیاب رہے ہیں۔

اس کتاب میں خواجہ نظام الدین اولیا کے ملفوظات کے علاوہ ضمنی طور پر ان کی خانقاہ کی چند تفصیلات بھی ہیں اور ان لوگوں کا مختصر تذکرہ بھی ہے جو اکثر و بیشتر خواجہ کے گرد و پیش جمع رہا کرتے تھے، مثلاً حسن دہلوی، مولانا شہاب الدین میرٹھی، مولانا وجیہ الدین پایلی، مولانا برہان الدین غریب، اور عثمان سیاح وغیرہ۔

نواں باب

امیر خسرو اور علی گڑھ

یہ بات ہر پڑھا لکھا شخص جانتا ہے کہ امیر خسرو نہ صرف فارسی زبان و ادب بلکہ دنیا کے ادبیاتِ عالیہ کی تاریخ میں بھی بلند مقام کے حامل ہیں۔ وہ ایک ایسی ہمہ گیر اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں کہ ان کو دنیا کے کسی بھی عبقری کے مقابلے میں اس اعتماد کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے کہ ان کا پلّہ نیچے نہ ہوگا۔ گذشتہ سات سو سال سے وہ اپنے ہندوی کلام، جیسے دوہے اور کہہ مکرنیوں کی وجہ سے ہندوستانی عوام میں مقبول رہے ہیں اور ان کی فارسی غزلوں نے اسلامی دنیا کی خانقاہوں میں ان کے نام کو زندہ رکھا ہے۔ ان کے اشعار میں وہ سوز و گداز اور وارداتِ قلبی کی کیفیت ہے کہ صوفیا ہر شعر پہ سر دھنتے ہیں۔ در شعرا و نقاد غزل کو ان کی شاعری

کی جان کہتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو خسرو کو اب تک وہ خراج تحسین پیش نہیں کیا گیا جو ان کی شایان شان ہے اور نہ ہی ان کی شعری ونثری تصانیف کی طرف کوئی خاص توجہ دی گئی۔ اس مسلسل بے اعتنائی کے باوجود کچھ ایسے خاندان ضرور رہے ہیں جہاں دیگر علما و شعرا کی تصانیف کے ساتھ ساتھ خسرو کی تصانیف بھی موجود رہی ہیں۔ یہ اور بات کہ جن لوگوں کے پاس خسرو کا یہ انمول علمی وادبی سرمایہ رہا، انھوں نے اس کی خاطر خواہ حفاظت نہیں کی اور بالآخر جیسا کہ نتیجہ لازم تھا، ساری کتابیں دیمکوں کی خوراک بن گئیں۔

ایک عرصہ دراز کے بعد منشی نولکشور کو کلیات خسرو کی طباعت کا خیال آیا تھا، اور انھوں نے تحقیق وجستجو کے بعد جو قلمی نسخے حاصل کیے ان کو اپنے پریس میں طبع کراکے شایع کر دیا (۱)۔ لیکن ان کے یہاں سے چھپی ہوئی کتابوں میں یہ ایک بہت بڑی کمی رہ گئی کہ جو نسخہ جس حالت میں ہاتھ آیا، اس کو اسی طرح چھاپ دیا گیا۔ نہ اس کی تصحیح وتنقید کی گئی، نہ اس پر حواشی لکھے گئے اور نہ ہی کوئی مقدمہ لکھا گیا۔ اس پر طرہ یہ کہ کاتبوں کی بے پروائی سے بہت سے اشعار مسخ ہو گئے کہ ان کا سمجھنا بھی دشوار ہو گیا۔ پھر بھی یہ تاریخی حقیقت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ منشی نولکشور نے پہلی بار تصانیف خسرو کو طبع کرا کے خسرو کو علمی وادبی دنیا میں باضابطہ طور پر متعارف کرایا۔ ان کا یہ عمل بذات خود ایک بہت بڑے کریڈٹ کی بات ہے۔

بیسویں صدی عیسوی کی ابتدا میں سرسید احمد خان کے خون جگر سے سینچا ہوا علمی گہوارہ عربی وفارسی زبان وادب کی تعلیم وترقی اور اشاعت کا ایک اہم ترین مرکز بن گیا تھا (۲)۔ دہلی، لکھنؤ اور عظیم آباد کی بربادی کے بعد اسلامی ہند کی تمام مستحسن علمی، ادبی، مذہبی اور تہذیبی وثقافتی روایات واقدار

---

(۱) مطبع نولکشور، لکھنؤ۔ (۲) مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ جو بعد کو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج ہوا اور اب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہے۔

اس ویرانہ نما چمن زار میں بیک وقت جمع ہو گئی تھیں، جس کا نام علی گڑھ کالج تھا۔ برصغیر ہند کے بیشتر عالم و فاضل اور شاعر و ادیب علی گڑھ تحریک سے وابستہ ہو کر سید مرحوم کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں مصروف ہو گئے تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں میں اصلاحی تحریک کو تقویت پہنچانے کا ایک موثر ذریعہ یہ بھی تھا کہ ان کے اسلاف کے علمی کارناموں کو بے کم و کاست ان کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ اس مقصد کے تحت علی گڑھ کالج نے ایسے تمام علما و فضلا اور شعرا و ادبا کو از سرِ نو زندہ کرنا شروع کیا جو امتدادِ زمانہ سے تقریباً گمنامی کے پردوں میں جا چھپے تھے — امیر خسرو بھی انھیں شاعروں میں سے ایک تھے، کیونکہ ان کا نام تو زندہ تھا مگر ان کے علمی و ادبی کارناموں کی قدر و قیمت سے لوگ اتنے واقف نہ تھے جتنا کہ ہونا چاہیے تھا۔ امیر خسرو کا تعلق علی گڑھ سے یا علی گڑھ کا تعلق ان سے یوں بھی زیادہ قریبی اور استوار ہے کہ وہ قصبہ پٹیالی، ضلع ایٹہ میں پیدا ہوئے تھے، جو علی گڑھ کا پڑوسی ضلع ہے۔ چنانچہ خسرو کی تصانیف کو تصحیح و تنقید اور حواشی و مقدمہ کے ساتھ باضابطہ طور پر طبع کرانے کا سلسلہ علی گڑھ کالج سے شروع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کام نے بہت جلد ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی۔

امیر خسرو کی تصانیف کی طباعت و اشاعت کے متعلق اگر علی گڑھ کی خدمات کا تاریخی جائزہ لیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ سب سے پہلے جس شخص نے ان پر قلم اٹھایا تھا، وہ خود سید ہی تھے۔ جب سرسید کے ذہن میں علی گڑھ تحریک اور کالج کی بنیاد کا خاکہ بھی نہیں تھا اور جس وقت وہ جوانی کی امنگوں اور جوش سے سرشار ہو کر دہلی کی تاریخی عمارتوں پر مشتمل "آثار الصنادید" کی تصنیف کر رہے تھے، اسی وقت انھوں نے امیر خسرو کے مقبرے کا ذکر کرتے ہوئے ان کی شخصیت اور شاعری پر چند جملے لکھے تھے (۱) سرسید کے بعد علی گڑھ سے متعلق جس دوسرے

---

(۱) آثار [illegible] ۱۸۴۷ عیسوی میں مکمل ہوئی تھی۔ (ص [illegible])

شخص نے پورے خلوص، وسیع مطالعے اور دقتِ نظر کے ساتھ امیر خسرو کے حالاتِ زندگی کو پیش کیا اور ان کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لیا، وہ مولانا شبلی نعمانی تھے۔ شبلی نعمانی نے عالمگیر شہرت رکھنے والی اپنی جس معرکۃ الآرا تصنیف میں فارسی کے متعدد شاعروں اور اساتذۂ فن کی ردیف میں امیر خسرو کی شاعری پر تنقید کی ہے، وہ شعر العجم ہے۔ یہ کتاب پانچ حصوں میں ہے اور اس کے دوسرے حصے میں شبلی نے جو کچھ خسرو پر لکھا ہے وہ خسرو شناسی کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر نذیر احمد لکھتے ہیں:

"شعر العجم کا دوسرا حصہ ساتویں صدی سے نویں صدی کے شعراء پر مشتمل ہے، اس حصہ میں اس دور کے نمائندہ شاعروں میں عطار، کمال اسمٰعیل، سعدی، خسرو، سلمان ساوجی، حافظ اور ابن یمین کی شاعری کا تجزیہ ہوا ہے، اسی دور کے ممتاز شاعر مولانا روم پر الگ رسالہ لکھنے کی وجہ سے یہاں ان کا تبصرہ شامل نہیں ہے، متذکرہ بالا شاعروں میں سعدی، خسرو اور حافظ کا تبصرہ خصوصیت سے قابلِ توجہ ہے۔ . . . . .

امیر خسرو کی شاعری پر آج تک ایسی مفصل تنقید نہیں ہوئی ہے، یہاں تک کہ ادھر امیر خسرو پر جو متعدد سیمینار ہوئے ان کی ساری بحثیں شعر العجم سے بے نیازی نہیں کرسکتیں، اسی طرح امیر خسرو کے حالات و کلام پر وحید مرزا کی کتاب حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہے، متعدد سیمینار کے مجموعی نتایج اس کتاب پر خاطر خواہ اضافہ نہیں کر سکے، امیر خسرو شاعری کی تینوں صنف یعنی قصیدہ، غزل اور مثنوی میں کمال پیدا کر کے وہ جامعیت حاصل کر چکے کہ فارسی میں اس کی مثال کم ملتی ہے، پھر خاص خاص موضوعات پر نظمیں لکھ کر ایشیائی شاعری پر جو اعتراض تھا اس کو رفع کر دیا، ان کی تشبیہات تقلید پرستی کی قید سے آزاد ہیں، ان کی تاریخی مثنویاں بہت اہم ہیں، لیکن خمسہ باوجود اپنی مقبولیت اور شہرت کے ان کی دوسری نظموں سے کچھ پست ہے، البتہ ان میں مجنوں لیلیٰ بہت زور دار مثنوی ہے۔

اور یہ مثنوی یقیناً نظامی کی مثنوی کے مقابلے کی ہے، امیر خسرو غزل گوئی کے لحاظ سے بہت ممتاز درجے کے مالک ہیں، ان کی غزل خمخانۂ سعدی کی شراب ہے جو دوبارہ کھینچ کر تیز ہو گئی ہے۔ تبصرہ کے ضمن میں جو اشعار منتخب ہوئے ہیں اس سے بہتر انتخاب کا تصور نہیں ہو سکتا (۱)

سرسید اور شبلی نعمانی کے بعد علی گڑھ کالج سے کلیات خسرو کی طباعت و اشاعت کی ایک ایسی تحریک کا آغاز ہوا جس سے برصغیر ہند کے گوشہ و کنار تک ان کے کارناموں کی شہرت پھیل گئی۔ اس زمانے میں ایسے ایسے لایق و فایق اساتذہ یہاں رہتے تھے کہ ان میں سے ہر ایک کو شعر و ادب کے میدان کا یکتا و یگانہ کہا جا سکتا ہے۔ استادوں کے علاوہ محنتی، ذہین اور قابل طالب علموں کی ایک بڑی تعداد بھی یہاں جمع ہو گئی تھی۔ طلبا و اساتذہ کے اس سنگم سے کالج میں جو علمی و ادبی فضا پیدا ہو گئی تھی، اس کی مثال اب شاید کہیں دیکھنے کو بھی نہیں مل سکتی۔ یہ انہیں لوگوں کی پرخلوص جد و جہد اور عرق ریزی کا نتیجہ تھا کہ خسرو کی تصانیف کا متعدد قلمی اور مطبوعہ نسخوں سے موازنہ کر کے ان کی تصحیح و تنقیح کی گئی اور پھر ان کو چھاپا گیا۔ یہ نسخے ملک کے مختلف کتب خانوں، شہروں اور گھرانوں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر لائے گئے تھے۔ خسرو کی جو کتابیں یہاں چھاپی گئیں ان پر سو سو اور کبھی اس سے بھی زیادہ صفحات پر مشتمل تمہید اور مقدمے کا اضافہ کیا گیا۔ ان تمہیدوں اور مقدموں میں خسرو کی زندگی کے مفصل حالات، اور ان کی تصانیف کی قدر و قیمت کو فارسی شاعری کے استادوں اور انشا پردازوں سے موازنہ کر کے متعین کیا گیا۔ ان میں سے زیادہ تر مقدموں کو اگر الگ شایع کر دیا جائے تو خسرو کے دیباچۂ غرۃ الکمال اور حالی کے مقدمۂ دیوان حالی کی طرح ایک مستقل تصنیف کی صورت میں عوام کے سامنے آ سکتے ہیں۔

علی گڑھ کالج میں کلیات خسرو کی طباعت و اشاعت کی جو تحریک

---

(۱) مولانا شبلی نعمانی کی فارسی خدمات، ڈاکٹر نذیر احمد سابق پروفیسر و صدر شعبۂ فارسی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ توسیعی لکچر، مطبوعہ ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ، بابت جنوری ۱۹۸۰ء (ص ۱۶ - ۱۵)۔

شروع ہوئی۔ اس میں یوں تو بہت سے لوگوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، لیکن ان میں دو شخصیتوں کے نام قابل ذکر ہیں۔ ایک نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی (۱) اور دوسرے نواب حاجی محمد اسحاق خاں (۲)، یہ دونوں افراد نہ صرف علم دوست اور ادب نواز گھرانوں کے چشم و چراغ تھے بلکہ سر سید ہی کی زندگی سے علی گڑھ کالج سے ان کے خاندان کا بہت ہی گہرا اور استوار تعلق رہا تھا، چنانچہ مولانا سید سلیمان اشرف لکھتے ہیں (۳):

"آج تقریباً سات سو برس کے بعد دوسرے نواب عماد الملک کے فیض تربیت سے کلام خسروی کے در یتیم تازہ آب و تاب سے دیدۂ روزگار کو روشن کر رہے ہیں۔۔۔ اہتمام کلیات خسروی کی باگ ایسے روشن دماغ کے ہاتھوں میں ہے جو ادب فارسی کے گھرانے کا چشم و چراغ اور حسرتی مرحوم کا خلف رشید ہے۔" (۴)

۱۹۱۴ سے ۱۹۱۸ عیسوی تک صرف چار سال کی مختصر مدت میں کلیات خسروی کی اشاعت کا شہرہ و غلغلہ ہندوستان بھر میں پھیل چکا تھا، لیکن اکتوبر ۱۹۱۸ عیسوی میں نواب حاجی محمد اسحاق خاں کے اچانک انتقال کے فوراً ہی بعد علی گڑھ کالج میں جو ناموافق اور ناخوشگوار حالات پیدا ہوئے، ان کی وجہ سے اس عظیم علمی و ادبی تحریک کو بڑا شدید دھکا لگا۔ لیکن تقریباً پانچ برس کے تعطل کے بعد ۱۹۲۳ عیسوی

---

(۱) ڈائرکٹر وزارت تعلیم ریاست حیدرآباد و پرائیوٹ سیکریٹری نواب سالار جنگ وزیر اعظم حیدرآباد

(۲) نواب اسحاق خاں، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ فرمانروائے ریاست جہانگیرآباد کے صاحبزادے تھے نواب مصطفیٰ خاں اردو فارسی دونوں زبانوں کے شاعر تھے اور اردو میں شیفتہ، در فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے۔ مولانا حالی نواب شیفتہ ہی کے شاگرد تھے۔ نواب اسحاق اس وقت علی گڑھ کالج کے سکریٹری تھے۔

(۳) سابق پروفیسر شعبہ دینیات، علی گڑھ کالج

(۴) مقدمہ مجموعۂ لیلیٰ، مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی، حبیب گنج (ص ۲)

میں ایک نئے جوش اور جذبے کے ساتھ یہ تحریک پھر زندہ کی گئی اور اس طرح جو کام ادھورا رہ گیا تھا اسے بھی پورا کیا گیا۔ اب ذیل میں امیر خسرو کی ان تصانیف کی فہرست دی جاتی ہے جن کو علی گڑھ سے تصحیح و تنقید اور تمہید و مقدمے کے اضافے کے بعد شایع کیا گیا ہے۔

(الف)

(۱) مطلع الانوار۔

مطلع الانوار ترتیب کے لحاظ سے خمسۂ خسروی کی پہلی مثنوی ہے اور نظامی کی "مخزن الاسرار" کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ اس میں امیر خسرو کے ایک شعر کے مطابق ۳۳۱۰ شعر ہونے چاہئیں

درہمہ بیت آوری اندر شمار

سیصد و دہ بر شمر دو سہ ہزار

لیکن مثنوی میں ۳۳۵۴ یعنی مصنف کی بتائی ہوئی تعداد سے ۴۴ شعر زاید ہیں۔ ان زاید اشعار کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ خسرو نے مثنوی مکمل کر لینے کے بعد مزید ۴۴ شعر کا اضافہ کیا ہوگا اور دوسری یہ کہ کتابت کے وقت خطاطوں نے غلطی سے الحاق کر دیا ہوگا۔ دوسری وجہ زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ زاید اشعار ٹھیک اس شعر کے بعد لکھے ہوئے ہیں جس پر خسرو نے اپنی عادت کے مطابق مثنوی کو ختم کر دیا ہے اور اس قسم کا اختتامیہ شعر ان کی تمام مثنویوں میں موجود ہے۔ چنانچہ ان ۴۴ شعروں سے پہلے مثنوی کا آخری اور اختتامیہ شعر یہ ہے:

من کنم آنچہ از دلم آید بکسب　　باقی الاتمام علی اللہ حسب

علی گڑھ سے مطبع ادور کا جو ایڈیشن چھپا ہے اس میں ۳۲۷۲ شعر یعنی الحاقی اشعار سے ۷۰ اور اصل سے ۱۷ شعر زاید ہیں۔ بہر حال یہ مثنوی متعدد قلمی نسخوں سے موازنہ اور تصحیح کیے جانے کے بعد ۱۹۲۶ عیسوی میں علی گڑھ سے طبع ہوئی اس کی تصحیح و طباعت کے نگراں محمد مقتدیٰ خاں شروانی تھے، جنھوں نے اس پر ۶۶ صفحے کا ایک طویل مقدمہ بھی لکھا ہے۔

(۲) **شیریں خسرو:** شیریں خسرو ترتیب کے لحاظ سے خمسۂ خسروی کے سلسلے کی دوسری مثنوی ہے۔ یہ مولانا نظامی گنجوی کے خمسے کی مثنوی "خسرو شیریں" کے جواب میں ہے اور اسی کی طرز پر لکھی بھی گئی ہے۔ اس کے متعلق عام خیال یہ تھا کہ نایاب ہو چکی ہے اور اب کہیں ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتی۔ لیکن نواب اسحاق خاں نے بالآخر امیر خسرو کی اس نایاب تصنیف کو تلاش و جستجو کے بعد منظر عام پر پیش کر دیا اور اس کا پہلا نسخہ جو دستیاب ہوا، وہ ان کے ذاتی کتب خانے جہانگیر آباد سے برآمد ہوا تھا۔ موصوف نے اس کی تصحیح و تنقید اور اشاعت اپنی نگرانی ہی میں کرانا چاہی تھی مگر ان کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی اور قبل از وقت وہ اس دنیا سے رخصت ہو گیے۔ شیریں خسرو کا ایک نسخہ مل جانے کے بعد اور بھی متعدد نسخے ملے جن سے مقابلہ کر لینے کے بعد یہ مثنوی شایع کی گئی اس کے مقابلہ اور تصحیح و تنقید میں جن نسخوں سے مدد لی گئی وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) **کتب خانہ جہانگیر آباد**
(۲) **دار الحبیب، حبیب گنج**
(۳) **کتب خانہ سلطنت آصفیہ، حیدر آباد**

نواب اسحاق خاں کا نسخہ ۸۹۷ ہجری کا لکھا ہوا تھا اور اس کی کتابت قدیم شاہانہ طرز کی تھی۔ مثنوی کے مقدمے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تین نسخوں کے علاوہ

اور بھی دو نسخے پیش نظر تھے۔ مگر ان کے متعلق یہ تحریر نہیں کیا گیا ہے کہ کہاں سے مل سکے تھے۔ بہر حال، پانچ نسخوں کی موجودگی میں شیریں خسرو کے متن کا مقابلہ کیا گیا ہے۔ امیر خسرو کے ایک شعر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ۴۱۲۴ شعر تھے:

دگر پرسی کہ بیتش را عدد چیست
چہار الف و چہار است و صد و بیست

لیکن پہلے اور چوتھے نسخے میں ۴۹۵ شعر ہے جبکہ دوسرے اور تیسرے نسخے میں ۴۱۰۹ شعر تھے۔ لیکن جس نسخے پر اس مثنوی کی تصحیح و تنقید کی بنیاد رکھی گئی تھی وہ ۴۱۲۰ شعر پر مشتمل تھا۔ گویا امیر خسرو کی بتائی ہوئی تعداد سے ۴ شعر اب بھی کم ہیں۔

نواب حاجی محمد اسحٰق خاں نے اس مثنوی کی تصحیح و تنقید اور مختلف نسخوں سے مقابلے کا کام مولانا حاجی علی احمد خاں اسیر قادری نقشبندی بدایونی کے سپرد کیا تھا جو فارسی زبان و ادب کے بڑے زبردست عالم و فاضل تھے (۱)۔ انھوں نے ۱۱۸ صفحات پر مشتمل مقدمہ بھی لکھا تھا جس کے تین باب ہیں۔

(۱) پہلے باب کا عنوان "حیات دوام خسرو" ہے۔ یہ صرف ۶ صفحے کا ہے جس میں امیر خسرو کی مختصر سوانح پیش کی گئی ہے۔

(۲) دوسرے باب کا عنوان "ریاض الابصار" ہے۔ یہ ۵۲ صفحے کا ہے۔ اس میں قصہ، واقعات اور کرداروں کو پیش کیا گیا ہے اور مثنوی کے فنی محاسن کا تنقیدی جایزہ بھی لیا گیا ہے۔

(۳) تیسرے باب کا عنوان "موازنۂ زبان اساتذہ" ہے اور یہ ۵۹ صفحے کا ہے۔

مولانا اسیر قادری نے اس مقدمے کا تاریخی نام "بے بہا ادمغان جاوید" تجویز کیا تھا۔ اس سے اور اس کے تین مختلف حصوں کے عنوانات سے ۱۳۲۶ ہجری برآمد ہوتا ہے۔

---

(۱) پروفیسر شعبہ فارسی، سینٹ جانس کالج، آگرہ

اس مثنوی کو مقابلہ، تصحیح و تنقید اور کتابت و طباعت کے طویل مرحلے سے گزرنا پڑا ہے۔ کیونکہ ۱۹۱۵ عیسوی میں طباعت کے لیے پہنچی تھی اور اس کے بیشتر حصے کی کتابت بھی ہو چکی تھی۔ مگر اس کی تصحیح کو ناقابلِ اطمینان قرار دے کر متن کی اشاعت روک دی گئی۔ مولانا اسیر نادری نے ۱۹۱۷ عیسوی میں تصحیح و مقابلہ کے بعد مقدمہ بھی پورا کر لیا تھا اور جو بقیہ کام انھوں نے ۱۹۲۲ء میں پورا کیا۔ لیکن علی گڑھ میں پیدا شدہ ناموافق حالات کے سبب اس کی اشاعت ملتوی رہی اور جب ۲۰ محرم الحرام ۱۳۴۶ ہجری کو مدینہ منورہ میں حالت نماز میں ان کا انتقال ہو گیا تو اس کے فوراً بعد ہی ان کی یہ پیش گوئی بھی پوری ہوئی کہ:

"ہماری زندگی میں یہ کام تمام ہوتا معلوم نہیں ہوتا۔"

مولانا اسیر کی موت کے چند ہفتے بعد ہی ۱۹۲۷ عیسوی میں محمد مقتدی خاں شروانی کی نگرانی میں یونیورسٹی پریس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے یہ مثنوی شائع ہو گئی۔ اس میں مولانا مذکور کا لکھا ہوا مقدمہ بھی شامل کیا گیا۔ اس مقدمے سے پہلے مقتدی خاں شروانی نے "ذکرِ اسیر" کے عنوان سے اپنی ایک تحریر بھی شامل کی ہے جس میں مولانا موصوف کی خدمات کا پورا پورا اعتراف کیا گیا ہے۔

(۳) مجنوں لیلیٰ

خمسۂ خسروی کے سلسلے کی تیسری مثنوی ہے جسے امیر خسرو نے نظامی کی "لیلیٰ مجنوں" کے جواب میں لکھا تھا۔ علی گڑھ سے اس مثنوی کا جو ایڈیشن شائع ہوا اس کی تصحیح و تنقید چھ نسخوں کا مقابلہ کر کے کی گئی ہے۔ ان میں ایک نسخہ ایسا تھا جو پہلے ہی سے دو نسخوں سے مقابلہ کیا ہوا تھا۔ حبیب گنج کے کتب خانے سے ملا ہوا نسخہ بالکل ہی نامعتبر تھا۔ لیکن جس نسخے پر اس مثنوی کے متن کی تصحیح و تنقید کی بنیاد رکھی گئی، وہ سالار جنگ کے کتب خانے سے آیا تھا، چونکہ اس میں دوسرے نسخوں کی بہ نسبت اغلاط بہت کم تھے، اس لیے یہ بہت معاون ثابت ہوا۔

اس کے متن کی تصحیح و تنقید اور مختلف نسخوں سے مقابلہ کرنے کا کام مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے انجام دیا۔ انھوں نے ۱۵۰ صفحات پر مشتمل ایک خاصا

طویل مقدمہ بھی اس پر لکھا ہے۔ یہ مقدمہ مندرجہ ذیل چار حصوں میں منقسم ہے:

(۱) ۱۹ صفحوں میں مجنوں اور لیلیٰ کے قصے کو نثر میں اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا۔

(۲) ۴ صفحوں میں مثنوی کے تمام کرداروں اور فن کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

(۳) اس کے علاوہ اس مثنوی میں امیر خسرو کے شاعرانہ محاسن اور طرز سخن پر بہت تفصیل سے تنقیدی بحث کی گئی ہے۔ اور ایران کے عظیم فارسی شعرا جیسے نظامی گنجوی، ملا مکتبی شیرازی اور ملا ہاتفی ہروی وغیرہ سے خسرو کی شاعرانہ اور فنکارانہ استعداد کا تنقیدی و تقابلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

(۴) اور امیر خسرو کی مثنوی "مجنوں لیلیٰ" کا موازنہ نظامی کی مثنوی "لیلیٰ مجنوں" سے بہت خوبصورتی کے ساتھ کیا گیا ہے۔

امیر خسرو کے ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ مجنوں لیلیٰ میں ۲۶۶۰ شعر تھے:

بیتش بہ شمار راستی ہست
جمد دو ہزار و شش و صد و شصت

لیکن جس نسخے پر موجودہ ایڈیشن کی بنیاد ہے اس میں ۲۵۶۰ شعر تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ خسرو کے بیان کے مطابق پورے ایک سو شعر کی کمی تھی۔ لیکن مختلف نسخوں سے موازنہ کے بعد اس میں مزید ۴۸ شعر کا اضافہ ممکن ہو سکا۔ اس طرح جو متن علی گڑھ سے شایع ہوا ہے اس میں کل ۲۶۰۸ شعر ہیں گویا اصل سے اب بھی ۵۲ کم رہ گیے ہیں۔

یہ مثنوی اپنی مکمل حالت میں ۱۹۱۷ عیسوی میں مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ کالج سے محمد مقتدیٰ خاں کی شروانی کی نگرانی میں شایع ہوئی ہے۔

(۴) آئینۂ سکندری: خمسۂ خسروی کے سلسلے کی چوتھی مثنوی ہے جو نظامی کی "سکندر نامہ" کے جواب میں ہے۔ اس کی تصحیح و تنقید اور نسخوں کے مقابلے کی ذمہ داری مولانا محمد سعید احمد فاروقی کے سپرد کی گئی تھی۔ علی گڑھ

سے آئینۂ سکندری کا جو ایڈیشن شایع ہو وہ تین نسخوں سے مقابلہ کیے جانے کے بعد مرتب ہوا ہے۔ پہلا نسخہ اغلاط سے پُر، اور دہلی کا چھپا ہوا تھا۔ دوسرا قلمی نسخہ تھا جو کتب خانہ سلطنت آصفیہ، حیدرآباد سے مستعار لیا تھا۔ تیسرا نسخہ خود نواب حاجی محمد اسحاق خاں کے ذاتی کتب خانے کا تھا۔ امیر خسرو کے بیان کے مطابق اس مثنوی میں ۴۴۵۰ شعر تھے:

گر آری ہمہ بیتش اندر عدد

چہار الف و پنجہ شد و چار صد

لیکن موجودہ ایڈیشن میں صرف ۴۴۱۱ شعر ہیں جس کا مطلب ہے کہ اصل سے ۳۹ شعر کم ہیں۔

مولانا سعید احمد فاروقی نے اس پر مقدمہ بھی لکھا ہے جو ۵۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مقدمے میں انھوں نے مثنوی نگاری کے فن جیسے صبح و شام رزم و بزم کے مناظر کی تصویر کشی، اور واقعات نگاری وغیرہ سے بحث کی ہے۔ علاوہ ازیں امیر خسرو نے اس مثنوی میں اخلاق کے موضوع پر جو اشعار لکھے ہیں، ان کا جائزہ لیا گیا ہے۔ امیر خسرو نے ہندوستانی رسم و رواج کو جتنے اچھوتے اور والہانہ انداز میں خوبصورت اور دلکش تشبیہات و استعارات کے ذریعہ بیان کیا ہے، اس سے ان کی وطن دوستی اور فنکارانہ چابکدستی ثابت کی گئی ہے۔

یہ مثنوی ۱۹۱۷ عیسوی میں محمد مقتدی خاں شروانی کی نگرانی میں مطبع انسٹی ٹیوٹ، علی گڑھ سے شایع ہو کر منظر عام پر آئی ہے۔

(۵) ہشت بہشت

ہشت بہشت خمسۂ خسروی کی آخری مثنوی اور نظامی کی "ہفت پیکر" کا جواب ہے۔ اس مثنوی کی تصحیح و تنقید میں متعدد نسخوں کے تقابلے کی ضرورت پیش آئی۔ کیونکہ پہلا نسخہ جو علی گڑھ کالج کے کتب خانے

میں تھا، وہ اس قدر کرم خوردہ تھا کہ ہر سطر سے الفاظ و حروف ناپید ہو گئے تھے جب اس پہلے نسخے نے ساتھ چھوڑ دیا تو مطبع نولکشور لکھنؤ سے چھپے ہوئے دو مختلف نسخے منگائے گئے لیکن یہ دونوں بھی بے سود ثابت ہوئے۔ بالآخر مذکورہ تین نسخوں کے علاوہ نواب اسحاق خاں اور حبیب گنج کے کتب خانوں سے بھی دو نسخے منگائے گئے۔ ان کے علاوہ بانکی پور لائبریری، رامپور، سہارنپور، حیدرآباد دیوبند وغیرہ کے نسخوں سے بھی مقابلہ کیا گیا۔ مگر جو نسخہ جتنا حسین تھا اتنا ہی صحت سے بھی دور تھا۔ اس طرح کل دس نسخوں سے مقابلے کے بعد متن کی تصحیح کی گئی اور اس اہم ترین کام میں مولانا محمد احتشام الدین کے علاوہ طالب علموں میں سید منظور حسن، سید علی احمد رضوی اور حافظ غلام غوث ـــــ اور مقتدیٰ خاں شروانی نے بھی پوری جانفشانی سے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں مدد دی۔ جیسا کہ امیر خسرو کے ایک شعر سے ظاہر ہے اس میں ۳۳۵۰ شعر ہیں۔

همه بیتش بگاه عرض شمار
سه صد و پنجه آمد و سه هزار

مولانا سید سلیمان اشرف نے بڑی دقتِ نظر کے ساتھ تصحیح و تنقید اور نسخوں کے مقابلے کے بعد اس مثنوی پر ۲۲ صفحات کا مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں شاعرہ فارسی شاعری، امیر خسرو کی شاعری اور ہشت بہشت اور ہفت پیکر کے مقابلے کے موضوع پر اجمالی تبصرہ موجود ہے۔ یہ مثنوی ۱۹۱۸ عیسوی میں محمد مقتدیٰ خاں شروانی کی نگرانی میں مطبع انسٹی ٹیوٹ، علی گڑھ کالج میں طبع ہوئی ہے۔

خمسۂ خسروی کی پہلی تین مثنویاں مطلع الانوار، شیریں و خسرو اور مجنوں لیلی ۶۹۸ ہجری میں صرف ایک سال کی مدت میں آئینۂ سکندری ۶۹۹ ہجری اور ہشت بہشت ۷۰۱ ہجری میں لکھی گئی تھیں۔ گویا صرف تین سال کی مختصر مدت میں امیر خسرو نے مولانا نظامی گنجوی کے اس خمسے کا جواب لکھ دیا جو ان کی زندگی بھر کی کاوشوں کا سرمایہ ہے۔ امیر خسرو نے یہ خمسہ سلطان علاؤالدین خلجی کے عہد میں اپنا

خمسہ لکھا تھا اس لیے اسی کے نام اس کا انتساب بھی کیا تھا۔ مگر جب یہ خمسہ علی گڑھ کالج اور پھر بعد کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تصحیح و تنقید اور تحشیہ کے بعد شایع ہوا تو فرمانروائے سلطنت آصفیہ حیدرآباد دکن جناب میر عثمان علی خاں کے نام معنون کیا گیا۔

(۶) **وسط الحیوٰۃ** : امیر خسرو کا یہ پہلا دیوان تاریخی واقعات کی تضمین کے اعتبار سے تاریخ میں ایک محققانہ اور مستند باب کا اضافہ ہے۔ اس میں تاریخی واقعات کے علاوہ علوم وفنون کی تضمین بھی ہوئی ہے اور اس کے ساتھ ہی سلاست وروانی اور عذوبت کو بھی انداز بیان میں ملحوظ رکھا گیا ہے۔ جذبات کی بے کم وکاست تصویریں اس کے ہر صفحے پر بکھری ہوئی نظر آتی ہیں۔

مختلف نسخوں سے مقابلے اور تصحیح کے بعد نفیس احمد صافق نے اس پر مقدمہ بھی قلم بند کیا جو ۱۰۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مقدمے کے دو باب ہیں۔ پہلے باب میں دیباچہ تحفۃ الصغر، دیباچہ وسط الحیوٰۃ اور دیباچہ غرۃ الکمال کی مدد سے دیوان وسط الحیوٰۃ کی ان خصوصیات سے بحث کی گئی ہے جو اس کی امتیازی شان ہے اور دوسرے باب میں اس دیوان میں شامل مختلف اصناف شعر کا جایزہ لے کر امیر خسرو کی شاعرانہ حیثیت اور ان کے مخصوص لب و لہجے اور رنگ و آہنگ کو متعین کیا گیا ہے۔

یہ دیوان ۱۹۲۰ عیسوی میں محمد مقتدی خاں شروانی کی نگرانی میں علی گڑھ سے چھپ کر منظر عام پر آیا ہے۔

(۷) **دول رانی خضر خاں** : یہ مثنوی صرف چار مہینے کی مدت میں شہزادہ خضر خاں کی فرمائش پر خسرو نے لکھی تھی۔ جب یہ مثنوی مکمل ہوئی تو اس وقت اس میں ۴۲۰۰ شعر تھے، لیکن مبارک شاہ خلجی کی موت کے بعد

خضر خاں پر گذری ہوئی مشقتوں کے واقعات کو خسرو نے تضمین کر کے اس میں شامل کیا تو مزید ۳۱۹ شعر کا اضافہ ہوگیا۔ اس طرح اس کے کل اشعار کی تعداد بقول امیر خسرو ۴۵۱۹ ہے:

دگر زیر و زبر گردند ہمہ
چہار الف است و پانصد بانُہ دہ

جن نسخوں سے مقابلہ کر کے اس مثنوی کو مرتب کیا گیا، وہ مدرسۃ العلوم حبیب گنج، حیدرآباد دکن، رامپور، بانکی پور، کلکتہ اور دہلی کے کتب خانوں سے دستیاب ہوئے تھے۔

علی گڑھ کا پہلا نسخہ جو سر سید کا نقل کرایا ہوا تھا، وہ چونکہ بہتر نسخہ تھا، اس لیے اسی کو موجودہ ایڈیشن کی بنیاد قرار دیا گیا۔ اس کے متن کی تصحیح کے لیے رامپور کے مزید تین نسخوں کو پیش نظر رکھا گیا جن سے مقابلہ کے وقت وہاں کے کتب خانے کے منشی سید محمد بھی شریک رہا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں موجودہ ایڈیشن کے لیے فرہنگ جہانگیری، فرہنگ رشیدی، منتخب التواریخ اور گلستان ہند سے بھی مدد لی گئی، کیونکہ ان فرہنگوں میں بھی اس مثنوی کے اشعار مندرج ہیں۔

مولانا رشید احمد انصاری (۱) نے نسخوں کے مقابلے اور تصحیح کا کام بڑی تندہی سے انجام دے کر اس پر ۱۱۰ صفحے کا مقدمہ بھی لکھا۔ جب اس کی طباعت ۱۹۱۷ عیسوی میں محمد مقتدا خاں شروانی کی نگرانی میں مطبع انسٹی ٹیوٹ، علی گڑھ کالج سے ہوئی، تو اس کو نواب میر عثمان علی خاں (۲) کے نام معنون کیا گیا۔

---

(۱) پروفیسر عربی و فارسی علی گڑھ کالج

(۲) فرمانروائے ریاست آصفیہ حیدرآباد۔

(۸) نصاب بدیع العجائب و نصاب مثلث

امیر خسرو کی اس تصنیف کے نسخوں کا مقابلہ اور تصحیح و تنقید کرنے کا کام مولانا رشید احمد انصاری کے سپرد کیا گیا تھا (۱)۔ انھوں نے جن مختلف نسخوں کی مدد سے اس کے متن کی تصحیح کی وہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) پہلا نسخہ نواب عماد الملک بلگرامی نے کتب خانہ ریاست آصفیہ حیدرآباد سے بھیجا تھا جو اغلاط سے بھرا ہوا اور مسخ شدہ تھا۔ مگر چونکہ اس وقت اس کے سوا کوئی اور نسخہ دستیاب نہ تھا، اس لیے اسی کو بنیاد قرار دے کر لغت کی کتابوں کی مدد سے متن کی تصحیح کا کام شروع کیا گیا۔

(۲) جب پہلے نسخے کی بنیاد پر تصحیح کا کام ختم ہونے کے قریب آیا تو مولوی ادریس احمد (۲) کو مطبع محمدی لکھنؤ کا چھپا ہوا ایک ایسا نسخہ مل گیا جس کی کتابت ۱۲۶۰ ہجری میں ہوئی تھی اور اس کی تصحیح و تنقید کا کام مولوی ابن حسن نے کیا تھا۔

(۳) دوسرا نسخہ مل جانے کے بعد متن کا تقابلی جائزہ لیا جانے لگا تھا کہ اسی اثنا میں دارالعلوم دیوبند سے ایک قلمی نسخہ بھی مل گیا جو مفتی سعداللہ خاں کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس میں مشکل الفاظ کی تشریح و توضیح کے علاوہ بین السطور حواشی بھی لکھے ہوئے تھے۔ مجموعی اعتبار سے یہ تیسرا نسخہ بہت ہی صحت مند اور معتبر تھا اور اس سے متن کی تصحیح میں کافی مدد ملی — مذکورہ بالا تینوں نسخوں کے مقابلے اور تصحیح و تنقید کے بعد جب کتاب پریس میں چھپنے کے لیے جانے لگی تو کچھ اور نسخے بھی ملے مگر ان سے استفادہ نہیں کیا جا سکا

---

(۱) یہ رسالہ "نصاب بدیع العجائب و نصاب مثلث" — امیر خسرو کے دیگر چار رسالوں کے مجموعے "لآلی عمان" یا "جواہر خسروی" میں بھی شامل ہے، اور ترتیب کے لحاظ سے پہلا رسالہ ہے۔

(۲) مولانا ادریس احمد شعر گوئی میں "سالم" تخلص کرتے تھے۔

یہاں اس امر کا ذکر ضروری ہے کہ کتب خانہ ریاست آصفیہ سے طاہرا وہ پہلا نسخہ جسے موجودہ ایڈیشن کی بنیاد قرار دیا گیا تھا، اس میں "نصاب بدیع العجایب" کے ساتھ ہی "نصاب مثلث" موسوم بہ "نصاب بدیعی" بھی شامل تھا، جس کے ورق پر اگرچہ بحیثیت مصنف امیر خسرو ہی کا نام تھا، لیکن خاتمے پر مصنف کا تخلص "بدیعی" اور یہ شعر بھی درج تھا:

این چنین شعر بدیعی را بدیعی نظم کرد
تا بود در روزگار از وی ہمین نام و نشان

اس سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ "نصاب مثلث" امیر خسرو کی تصنیف نہیں، مگر چونکہ تمام قلمی نسخوں میں "نصاب بدیع العجایب" کے ساتھ بدیعی کا "نصاب مثلث" بھی شامل رہا ہے، اس لیے مولانا موصوف نے بدیعی کے اس نصاب کو الگ نہیں کیا اور دونوں کو ایک ساتھ رکھنے کے جواز میں مندرجہ ذیل سطور لکھے ہیں:

"اس سے قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ یہ رسالہ امیر خسرو کا نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں ایک جلد نصاب بدیعی کی میری نظر سے گذری جس میں سے رسالہ نکال لیا گیا تھا اور اس جلد پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:

"نصاب بدیعی، از نصاب ہای مولوی بدیع۔"

اس عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولوی محمد بدیع نے جو متعدد نصاب لکھے ہیں، ان میں سے ایک "نصاب بدیعی" بھی ہے۔ اگرچہ شہادتیں اس امر کے ثبوت کے لیے کافی ہیں کہ نصاب بدیعی حضرت امیر خسرو کی تصنیفات میں سے نہیں ہے لیکن اس وقت تک جس قدر مطبوعہ اور قلمی نسخے میری نظر سے گذرے ہیں، ان میں "نصاب بدیع العجایب" کے ساتھ "نصاب بدیعی" شامل پائی گئی ہے۔ اس لیے میں نے بزرگواران سلف کی سنت جاریہ سے اعراض کرتے ہوئے

ادبی جتاں کیا اور دونوں رسالوں کے شیرازۂ اتصال کو توڑنے کی جرأت نہیں کی۔ غالبًا ناظرین کرام کی خدمت میں یہ اعتذار میری معذرت کے لیے کافی ہوں گے (۱)۔"

مولانا موصوف آگے چل کر امیر خسرو کے "نصاب بدیع العجایب" سے متعلق مزید لکھتے ہیں:

. . . نصاب بدیع العجایب میں حضرت امیر خسرو نے کسی جگہ اپنا تخلص نہیں لکھا ہے۔ حالانکہ ان کی عادت ہے کہ وہ ہر تصنیف میں متعدد جگہ اپنا نام لاتے ہیں۔ حتیٰ کہ "خالق باری" جو معمولی چیز ہے اس میں بھی ان کا نام موجود ہے۔ اس کے علاوہ کسی تذکرہ نویس نے حضرت کی تصنیفات کی فہرست میں اس نصاب کا ذکر نہیں کیا (۲)۔"

رشید صاحب کے متذکرہ بالا دونوں بیانات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ "انساب مثلث" یا "نصاب بدیع" کو قطعی طور پر امیر خسرو کی تصنیف تسلیم نہیں کرتے، لیکن اس کے ساتھ ہی رسالہ "نصاب بدیع العجایب" بھی ان کے نزدیک مشکوک ہے، جبکہ اس کے امیر خسرو کی تصنیف ہونے پر جمہور علما متفق ہیں۔ وہ اپنے اس شک کے جواز میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ ان کی نظر سے اس کا کوئی بھی نسخہ ایسا نہیں گذرا جو ڈیڑھ سو سال قبل سے اوپر کا لکھا ہوا ہو۔ بہرحال چونکہ تحقیق کا دروازہ کھلا ہوا ہے، اس لیے ممکن ہے کہ آئندہ کوئی محقق قطعی طور پر یہ ثابت کر دے کہ "نصاب بدیع العجایب" امیر خسرو کی تصنیف ہے یا نہیں، لیکن یہ بات بھی قابل غور ہے کہ پروفیسر وحید مرزا اس رسالے کو خسرو کی تصنیف تسلیم کرتے ہیں۔ (۳)

---

(۱) مقدمہ نصاب بدیع العجایب (ص ۴) (۲) ایضاً (ص ۵-۶) (۳) امیر خسرو (ص ۱۹۴)

یہ رسالہ ۱۹۱۶عیسوی میں علی گڑھ سے چھپا تھا اور اس کی تصحیح و تنقید میں سید محمد ریاض حسن (۱) نے مولانا رشید کی بہت مدد کی تھی رشید صاحب نے اس پر بارہ صفحے کا مقدمہ بھی لکھا تھا۔ جب یہ رسالہ علی گڑھ سے چھپا تو اس کو نواب میر عثمان علی خاں (۲) کے نام منسوب کیا گیا تھا۔

---

(۹) لآلیِ عُمّان

لآلیِ عمّان ــــ جسے عرفِ عام میں "جواہرِ خسروی" بھی کہتے ہیں، امیر خسرو کے مختلف پانچ رسالوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ایک "نصابِ بدیع العجائب" بھی ہے جسے ترتیب میں سب سے پہلے رکھا گیا ہے۔ اس کا ذکر الگ سے ہو چکا ہے۔

نصابِ بدیع العجائب کے علاوہ بالترتیب چار رسالوں کے نام ہیں ــــ گھڑیاں، رباعیاتِ پیشہ وراں، خالق باری اور چیستاں ــــ اب ذیل میں سب کا الگ الگ ذکر کیا جاتا ہے :

(الف) گھڑیال

امیر خسرو کی یہ مختصر سی فارسی نظم جس کا عنوان "گھڑیال" ہے کوئی تحریری دستاویز نہیں بلکہ عوام میں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی چلی آئی ہے۔ علی گڑھ کالج کی "امیر خسرو کمیٹی" کو یہ نظم منشی محمد اصغر علی خاں کی بیاض میں ملی (۱)۔ وہیں سے نقل کر کے اسے جولائی ۱۹۱۷عیسوی میں چھپوایا گیا۔ اس میں صرف ۱۹ شعر ہیں اور جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے، وقت سے متعلق ہیں۔ محمد امین عباسی چریاکوٹی نے اس پر ایک صفحے کا مقدمہ بھی لکھا۔ جب یہ نظم علی گڑھ سے طبع ہوئی تو اس کا انتساب نواب محمد اسحاق خاں کے نام کیا گیا۔

---

(۱) والد مولوی حافظ احمد علی خاں شوق (سپرنٹنڈنٹ حرفِ خاص نواب رامپور)

(ب) رباعیات پیشہ وراں

امیر خسرو کے اس رسالے کا تاریخی نام "مثنوی شہر آشوب" ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ کوئی مستقل تصنیف نہیں مگر مثنوی شہر آشوب کا ضمیمہ ہے۔ نواب اسحاق خاں کے حوالے سے پروفیسر وحید مرزا نے خسرو کی تصانیف کی جو فہرست دی ہے، اس میں ۳۲ نمبر کا نام "شہر آشوب یا مجموعۂ رباعیات" لکھا ہے (۱) اور آگے چل کر یہ بھی لکھا ہے کہ شہر آشوب کا ایک قلمی نسخہ لکھنؤ میں مل گیا (۲)۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ موصوف نے "رباعیات پیشہ وراں" ہی کو "شہر آشوب" سمجھ لیا ہے۔ بہر حال، متذکرۂ بالا اسناد سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ مثنوی شہر آشوب تو ناپید ہو گئی مگر یہ رباعیاں جو دہلی کے پیشہ وروں سے متعلق ہیں، کسی طرح بچ کر ایک مستقل تصنیف کی صورت اختیار کر گئی ہیں۔

اس رسالے کے متن کا مقابلہ صرف ایک ہی نسخے سے ہو سکا جو قلمی تھا۔ اس کی تصحیح و تنقید کا کام مولوی سید احمد حسن (۳) نے کیا تھا اور جو کچھ ان سے باقی رہ گیا تھا۔ اسے محمد امین عباسی نے پورا کیا اور اس پر دو صفحے کا مقدمہ بھی لکھا۔

---

(۱) امیر خسرو (ص ۱۹۳)

(۲) " " (ص ۱۹۴)

(۳) شوکت میرٹھی

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ خسرو نے کس مقصد سے اور کس موقع پر یہ رباعیاں کہی تھیں مگر یہ بات اپنی جگہ مسلّم ہے کہ یہ لطایف ان کے تفنن طبع کا بہترین مظہر ہیں۔ اگر ان کے اس رسالے کا سراغ نہ ملتا تو خسرو کی افتادِ طبع کے ایک اہم پہلو سے ناواقفیت رہ جاتی۔ تاریخی نقطۂ نظر سے ان ۷۷ رباعیوں کی صرف اتنی اہمیت ہے کہ ان سے اس عہد کے دہلی کے پیشہ وروں کے نام اور ان کے مختلف اشغال کا پتہ چلتا ہے۔

(ج) خالق باری

علی گڑھ سے خالق باری کا جو ایڈیشن چھپا ہے [۱] اس کے متن کی تصحیح کے لیے جن نسخوں کو مقابلے میں پیش نظر رکھا گیا، وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) پہلا نسخہ ۱۹۱۱ عیسوی کا مطبوعہ نولکشور لکھنؤ ہے جس پر حواشی لکھے ہوئے تھے۔

(۲) دوسرا نسخہ ۱۸۸۸ عیسوی کا ہے۔ یہ بھی نولکشور ہی میں چھپا تھا۔ مگر اس پر حواشی نہیں تھے۔

(۳) تیسرا نسخہ ۱۳۲۵ ہجری کا ہے جو کانپور میں چھپا تھا۔ اس پر حاشیہ نہیں لکھا ہوا تھا۔

(۴) چوتھا نسخہ مع حواشی کے سلطان المطابع کا چھپا ہوا ہے۔

(۵) پانچواں نسخہ گلشن احمدی پرتاپ گڈھ کا مطبوعہ ہے۔

(۶) چھٹا نسخہ ۱۲۵۷ ہجری کا ہے جو مطبع مصطفائی میں چھپا تھا۔

(۷) اور ساتواں نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ ہے۔

خالق باری کے تمام مطبوعہ نسخوں میں ۱۹۲ شعر ملے جبکہ کلکتہ کے قلمی نسخے میں ۲۱۵ شعر یعنی مطبوعات سے ۲۳ شعر زیادہ پائے گئے۔ جتنے نسخوں پر

---

(۱) رئیس رسول پور (مظفر پور) صوبہ بہار (ہ) فرماں روائے ریاست آصفیہ، حیدرآباد۔

حواشی ملے وہ سب بقول امین عباسی "غلط تھے۔ اس لیے ان کی تصحیح کے لیے رسالے کے ساتھ ایک فرہنگ بھی شامل کردی گئی ہے، جس کے متعلق امین عباسی نے یہ لکھا ہے:

"ہندی بھاشا اور سنسکرت الفاظ کی تحقیق اور الفاظ کے سواد دیوناگری حرفوں میں معہ ان کے صحیح تلفظ کے جمع کر دیے گیے ہیں تاکہ آیندہ امتداد زمانہ سے پھر ان الفاظ کی صحت میں خلل یا شبہہ واقع نہ ہو (۱)۔"

اردو میں سب سے قدیم اور پہلا لغت خالق باری ہے جسے پچھلے سات سو برس میں ہزاروں خطاطوں نے زیور کتابت سے آراستہ کیا ہے اور پچھلے ڈیڑھ سو سال میں اس کے درجنوں ایڈیشن شایع ہو چکے ہیں۔ اس کے باوجود یہ مسئلہ آج تک متنازعہ فیہ بنا ہوا ہے کہ آیا اس کے مصنف امیر خسرو ہیں یا ضیاءالدین خسرو، یا کوئی اور ہے۔ پروفیسر وحید مرزا نے "خالق باری" کے امیر خسرو کی تصنیف ہونے پر اپنے شبہہ کا جو اظہار کیا ہے، اس کا ذکر آٹھویں باب میں ہو چکا ہے اور پروفیسر محمود شیرانی نے اپنی کتاب "حفظ اللسان" میں یہ ثابت کیا ہے کہ خالق باری امیر خسرو کی نہیں بلکہ ضیاءالدین خسرو کی تصنیف ہے (۲)۔ لیکن صفدر آہ جو محمود شیرانی کی اس تحقیق کو بے بنیاد اور لغو سمجھتے ہیں، انھوں نے اپنی کتاب "امیر خسرو بحیثیت ہندی شاعر" میں حفظ اللسان میں کیے گیے اعتراضات کا نکتہ بہ نکتہ جواب دیا ہے، اور اس بات پر اصرار کیا ہے کہ خالق باری امیر خسرو ہی کی تصنیف ہے۔ چنانچہ وہ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

"میں اپنی کتاب "امیر خسرو بحیثیت ہندی شاعر" میں محمود شیرانی کے تمام شبہات اور اعتراضات کا نکتہ بہ نکتہ جواب دے چکا ہوں۔ میری کتاب کی اشاعت کو تقریباً دس سال ہو چکے ہیں لیکن ابھی

---

(۱) مقدمہ خالق باری (۲) امیر خسرو کی مادری زبان، صفدر آہ۔ امیر خسرو نمبر، ماہنامہ "آجکل" نئی دہلی۔

تک کسی نے میرے پیش کردہ دلائل کا جواب نہیں دیا ہے، بلکہ بہت سے اہل علم نے میری تائید کی ہے۔ پروفیسر احتشام حسین مرحوم جیسے نقاد نے مجھ سے اتفاق، اور محمود شیرانی سے اختلاف کیا ہے۔ پاکستانی رسایل میں بھی جہاں جہاں میری کتاب پر تبصرے ہوئے ہیں، کسی نے مجھ سے اختلاف نہیں کیا ہے"۔ (۱)

محمد امین عباسی چریاکوٹی، جنھوں نے خالق باری کے نسخوں کا مقابلہ اور اس کے متن کی تصحیح و تنقید کر کے اس پر ۱۲ صفحے کا مقدمہ لکھا ہے، اپنے اس دعوے کے ثبوت میں کہ امیر خسرو ہی کی تصنیف ہے، لکھتے ہیں:

"بعض محاورات اور الفاظ مستعملہ کتاب کی قدامت صاف یہ پتہ بتلاتی ہے کہ یہ کتاب عہد حضرت امیر خسرو کے متصل زمانہ کی تصنیف ہے۔ جیسے "چیتل" کہ حضرت امیر خسرو کے عہد زندگی تک یہ ایک ہندی سکہ کا نام تھا اور حضرت کے قریب عہد میں یہ متروک ہو چلا تھا، یہاں تک ان کے بعد تاریخ میں اس کا نام بھی نہیں آتا .... بہر حال "چیتل" کا چلن عہد خسروی سے آگے نہیں پایا جاتا۔ یا محاورات قدیمہ جیسے "میں تجھ سے کہیا" (میں نے تجھ سے کہا)۔ "کو کت رہیا" (تو کہاں رہا)، "باو اڑانی" (ہوا چلی)۔ "آکھنا" (دیکھنا)، "بھاکھنا" (دکھنا)، "چاؤ" (شوق)۔ وغیرہ ان الفاظ کی گواہی سے خالق باری کا زمانۂ تصنیف عہد خسروی قطعی طور پر برقرار اور متعین ہو سکتا ہے، اور اس عہد میں ہندی اور سنسکرت کی ان ترکیبوں پر حضرت امیر خسرو کے سوا اور کسی کے قلم کو یہ روانی ثابت نہیں۔ پس اس میں شک کرنے کی بہت کم وجوہ ہیں کہ خالق باری حضرت امیر خسرو کی تصنیف نہیں ہے"۔ (۲)

خالق باری میں عربی و فارسی کے فردی لغات کو اس وقت کی مستعمل اردو

---

(۱) امیر خسرو کی مادری زبان، صفحہ ۲۰۵۔ امیر خسرو نمبر ماہنامہ "آجکل" نئی دہلی۔ نومبر ۱۹۷۴ء (ص ۱۲)

(۲) مقدمہ خالق باری (ص ۵-۶)

رائج زبان میں ترتیب دی گئی ہے۔ اس وقت ایسی کسی کتاب کی ضرورت بھی تھی کیونکہ ترکستان، ایران، افغانستان اور حوازم شاہ جیسے اسلامی ممالک سے نئے آنے والے مسلمانوں کو یہاں کی زبان سمجھنے اور مقامی لوگوں کو اپنا مافی الضمیر سمجھانے میں دشواریوں کا سامنا تھا۔

امیر خسرو نے اپنے ذاتی اجتہاد سے اس عہد کی ایک اہم لسانی ضرورت کو پورا کر کے ایک بڑا کارنامہ انجام دیا۔ اس میں عربی اور ہندی بھاشا کے الفاظ کے معنی فارسی میں بتائے گیے ہیں، گویا فارسی ہی اس کی "میڈیم لینگویج" ہے۔

خالق باری کے مطبوعہ نسخوں اور ایک قلمی نسخے میں ۱۳۰ شعر مشترک ہیں۔ لیکن مطبوعات کے ۴۲ شعر قلمی نسخے میں نہیں ہیں اور اسی طرح قلمی نسخے کے ۸۵ شعر مطبوعات میں نہیں ملتے۔ اس لیے ان ۸۵ شعروں کا ایک ضمیمہ بھی الگ سے شامل کر دیا گیا، تاکہ یہ ضائع نہ ہونے پائیں۔

(د) چیستاں

امیر خسرو کا یہ رسالہ ان کی پہیلیوں کا مجموعہ اور ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کو منشی محمد مستجاب اللہ خاں مقبول شروانی کے بھیجے ہوئے مواد سے مرتب کیا گیا تھا۔ محمد امین عباسی نے تصحیح و تنقید کے بعد اس پر ایک بہت ہی بسیط مقدمہ بھی لکھا ہے جو ۲۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مقدمے میں پہیلی کے آغاز و ارتقا کی تاریخ پر مفصل بحث کی گئی ہے۔

مندرجہ بالا چاروں رسایل کا مجموعہ "لالی عثمان" جب ۱۹۱۸ عیسوی میں مطبع انسٹی ٹیوٹ، علی گڑھ کالج سے محمد مقتدا خاں شروانی کی نگرانی میں زیور طباعت سے آراستہ ہوا تو مجموعی اعتبار سے اس کا انتساب نواب میر عثمان علی خاں (۱) کے نام کیا گیا۔

---

(۱) فرمانروائے ریاست آصفیہ حیدر آباد

(۱۰) قران السعدین

قران السعدین امیر خسرو کی طبع زاد اور ادبی لحاظ سے بہت اہم مثنوی ہے۔ لیکن اس کی تاریخی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی تصنیف ۶۹۸ ہجری سے قبل ہوئی تھی۔ کلیات خسروی کی طباعت و اشاعت کا جو سلسلہ علی گڑھ میں شروع ہوا تھا، اس کے تحت امیر خسرو کی زندگی کے حالات اور ان کے کارناموں کو لکھنے کی ذمہ داری مولانا محمد اسمعیل میرٹھی کے سپرد کی گئی تھی۔ انھوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات اور علالت کے باوجود اپنی زندگی کے گراں قدر آخری ڈھائی سال تک پوری لگن کے ساتھ اس عظیم علمی کام کو انجام دیا۔ ان کی علم دوستی اور خلوص کی انتہا یہ تھی کہ بیماری کے دنوں میں بھی وہ بستر پر لیٹے لیٹے کچھ نہ کچھ کام کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے خسرو کی زندگی کے حالات کے لیے بڑی محنت سے مواد جمع کیا اور اس کے چند اجزا بھی ترتیب دیے، جس میں معز الدین کیقباد کے آخری عہد تک کے حالات مندرج ہیں۔ لیکن یکم نومبر ۱۹۱۷ عیسوی کو سہ پہر کے وقت ۷۵ برس کی عمر میں انتقال ہو جانے کی وجہ سے یہ کام ان کے ہاتھوں پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

مولانا موصوف نے ۱۷۶ صفحات پر مشتمل قران السعدین کا مقدمہ بھی لکھا تھا۔ انھوں نے اس مثنوی کے اشعار کی کل تعداد ۲۹۴۴ بتائی تھی۔ لیکن مقتدی خاں شروانی کی تحقیق کے مطابق اس میں ۳۷۹۰ شعر ہیں۔

مسٹر سید حسن برنی[1] نے قران السعدین پر ۶۱ صفحے کی تمہید لکھی۔ یہ مثنوی ۱۹۱۸ عیسوی میں محمد مقتدی خاں شروانی کی نگرانی میں مطبع انسٹی ٹیوٹ، علی گڑھ کالج میں طبع ہو کر منظر عام پر آئی۔

---

(۱) مہتمم کلیات خسروی اور جزل اسسٹنٹ صدر دفتر مسلم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔

(ب)

نواب حاجی محمد اسحاق خاں کے زیر قیادت ۱۹۱۲ عیسوی میں علی گڑھ کالج سے تصانیف خسرو کی تصحیح و تنقید اور طباعت و اشاعت کی تحریک شروع ہوئی تھی، اس وقت یہاں بڑے بڑے علما و فضلا موجود تھے، لیکن جیساکہ قدرت کا نظام ہے ایک بعد دیگرے وہ تمام بزرگ دنیا سے رخصت ہوتے گئے جن پر اس تحریک کا دارومدار تھا، یہاں تک کہ اکتوبر ۱۹۱۸ عیسوی میں ایک روز نواب مرحوم نے بھی رخت سفر باندھ لیا۔ اس سانحہ کے ساتھ ہی علی گڑھ کالج کا کیمپس برصغیر ہند اور خصوصیت سے شمالی ہند کے مسلم رہنماؤں کی زور آزمائی کا اکھاڑا بن گیا، کیونکہ اس وقت پورے ملک میں کالج کو مسلم یونیورسٹی کی شکل میں بدل دینے کی تحریک چل پڑی تھی، چنانچہ ایسے شدید بحرانی حالت میں کسی طرح بھی یہ ممکن نہیں تھا کہ خسرو کی طرف بھی اہل علم کی توجہ مبذول ہوتی۔ جب ۱۹۲۰ عیسوی میں برٹش پارلیامینٹ کی طرف سے مسلم یونیورسٹی ایکٹ پاس ہو گیا تو اس کے کچھ عرصہ بعد ۱۹۲۲ عیسوی میں "کلیات خسرو کمیٹی" کے ذمہ داروں نے پھر اس علمی کام کی طرف توجہ دی اور ۱۹۲۷ عیسوی تک یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔

علی گڑھ میں ۱۹۱۲ سے ۱۹۲۷ عیسوی تک کے درمیان "کلیات خسرو کمیٹی" کے زیر اہتمام امیر خسرو کی جن تصانیف کو زیور طباعت سے آراستہ کیا گیا، ان کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ لیکن یہ کام یہیں ختم نہیں ہوا بلکہ اسی سال پروفیسر محمد حبیب (۱) کی ایما پر "سلطانیہ ہسٹوریکل سوسائٹی"، مسلم یونیورسٹی کی جانب سے

(۱) صدر شعبہ تاریخ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

خسرو کی ایک نثری تصنیف "خزاین الفتوح" شایع کی گئی، اور پروفیسر موصوف نے خود بھی ایک کتاب لکھی جس کا نام "حضرت امیر خسرو آف دہلی" ہے۔

ابھی چند سال قبل ہی امیر خسرو کی عظیم نثری تصنیف "اعجاز خسروی" کو ایڈیٹ کرنے پر شعبہ تاریخ، مسلم یونیورسٹی کی طرف سے ڈاکٹر مظہر لیسین صدیقی (۱) کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی ہے۔ چنانچہ اب ذیل میں مذکورہ تینوں نثری کتابوں کی بابت چند سطور سپرد قلم کیے جاتے ہیں۔

خزاین الفتوح

امیر خسرو کی یہ گراں قدر تصنیف اپنی تاریخی اہمیت کے لیے مشہور ہے کیونکہ اس میں سلطان علاءالدین خلجی کی مہمات و فتوحات کا بیان ہے۔ پروفیسر حبیب کے پاس برٹش میوزیم (اورینٹل ۱۶۳۸) کے نسخے سے لی گئی تصویر کی ایک کاپی تھی اور اسی نسخے سے نقل کیا ہوا ایک نسخہ سید حسن برنی کے پاس بھی تھا۔ جس کی بنیاد پر سید معین الحق (۲) نے اس تصنیف کو مدون و مرتب کیا۔ پروفیسر ابو بکر عبد الحلیم (۳) نے اس پر ڈیڑھ صفحے کا پیش لفظ، سید معین الحق نے چار صفحے کا دیباچہ اور پروفیسر محمد حبیب نے پندرہ صفحے کی تمہید لکھی، جو انگریزی میں ہے۔

یہ کتاب "سلطانیہ ہسٹوریکل سوسائٹی" کی جانب سے علی گڑھ پرنٹنگ ورکس میں چھپ کر ۱۹۲۷ عیسوی میں شایع ہوئی، اور اس کا انتساب میاں سر محمد شفیع کے سی۔ ایس۔ آئی (۴)، خان محمد سعادت علی (۵) اور نواب سمیع اللہ بیگ (۶)

---

(۱) لکچرر شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (۲) استاد شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
(۳) شعبہ تاریخ . . . (۴) بار ایٹ لا، لاہور (۵) رئیس لاہور
(۶) چیف جسٹس حیدرآباد، دکن

کے نام کیا گیا۔

(۲) حضرت امیر خسرو آف ڈہلی

پروفیسر محمد حبیب کی یہ کتاب انگریزی میں ہے۔ اور جیسا کہ مصنف نے دیباچے میں خود ہی لکھا ہے:

"یہ کتاب ادبی نہیں بلکہ تاریخی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے اور اس میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ جس شخص میں امیر خسرو کی سوانح عمری لکھنے والوں کے لیے واضح اور روشن خطوط متعین کیے جا سکیں۔"

جب یہ کتاب ۱۹۲۷ عیسوی میں مسلم یونیورسٹی پبلیکیشنز ڈویژن کی طرف سے شائع ہوئی تو اس وقت اس کا انتساب نواب سر محمد مزمل اللہ خاں کے نام کیا گیا (۱)

یہ کتاب مندرجہ ذیل تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب ۳۸ صفحے کا، دوسرا باب ۴۵ صفحے کا اور تیسرا باب ۱۳ صفحے کا ہے، گویا صرف ۹۶ صفحات میں کتاب مکمل ہو گئی ہے اس کا دیباچہ بھی صرف ایک پیراگراف کا ہے۔ مسٹر حامد علی (آئی سی ایس) نے اس کتاب کی تصنیف میں پروفیسر حبیب کی خاطر خواہ مدد کی جس کا ذکر انھوں نے دیباچے میں خود ہی کیا ہے۔ اس کتاب کے موضوعات حسب ذیل ہیں۔

(۱) حیات ـــــ اس میں امیر خسرو کی زندگی کے تفصیلی حالات درج ہیں۔

(۲) شاعرانہ خدمات ـــ اس میں خاص منظوم تصانیف کی خصوصیات اور ان کی تاریخی اہمیت سے بحث کی گئی ہے

(۳) نثری خدمات ـــ اس میں منثور تصانیف کی تاریخی اہمیت کا جائزہ لیا گیا ہے۔

---

(۱) وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

اعجاز خسروی

ڈاکٹر سید نور الحسن (۱) نے ۱۹۶۸ء میں ڈاکٹر محمد یسین مظہر صدیقی کے (۲) پی، ایچ، ڈی کے مقالے کے لیے امیر خسرو کی ضخیم و ادق کتاب اعجاز خسروی کو منتخب کیا تھا۔ بنیادی طور پر ڈاکٹر صدیقی کا کام اس کتاب میں تاریخی مواد کی تلاش، تنقیح اور تنقید تھی مگر پھر لگے ہاتھوں پوری کتاب کا ایک تنقیدی ایڈیشن بھی تحقیقی مقالے میں شامل کر دیا گیا۔ بہر حال برٹش میوزیم لندن میں محفوظ مخطوطہ (نمبر ۱۶۸۴۱) کو بنیاد بنا کر کتاب کا متن تیار کیا گیا، اور انڈیا آفس لائبریری لندن، سالار جنگ میوزیم حیدر آباد، آصفیہ لائبریری حیدر آباد اور خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ مخطوطات اور منشی نولکشور لکھنؤ کے مطبوعہ نسخے کی مدد سے متن کی تصحیح و تدوین کا کام انجام دیا گیا۔ چونکہ کتاب ضخیم تھی اور تصحیح وغیرہ کی وجہ سے اس کی ضخامت میں کافی اضافہ ہو گیا تھا اس لیے مقالے کے نگراں پروفیسر خلیق احمد نظامی (۳) کے مشورے پر رسایل الاعجاز کو پانچ جلدوں میں منقسم کر دیا گیا۔ ہاتھ کے لکھے ۲۲۱۶ صفحات پر پورا متن آسکا۔ جلدوں کے اعتبار سے صفحات کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) جلد اوّل:	۳۴۷	صفحات
(۲) جلد دوم:	۶۸۹	"
(۳) جلد سوم:	۲۰۵	"
(۴) جلد چہارم:	۵۹۷	"
(۵) جلد پنجم	۳۷۸	"
کل	۲۲۱۶	

(۱) سابق پروفیسر و صدر شعبۂ تاریخ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (۲) لیکچرر ایضاً (۳) پروفیسر و صدر، ایضاً

متن کی پانچ جلدوں میں مقدمہ کی ایک جلد کا اور اضافہ ہوا۔ یہ مقدمہ انگریزی میں ہے۔ اس کے تین باب ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے :

پیش لفظ		۱ - ۲
باب اوّل	صفحہ	۳ - ۵۵

یہ باب فارسی میں انشائیہ ادب کے ماخذ و ارتقا سے تعلق ہے۔ شروع میں عربی ادب میں انشا کے فن کے آغاز سے بحث کی گئی ہے کہ عہدِ نبوی سے عہد عباسی کے خاتمے تک انشا کے میدان میں عرب انشا پردازوں نے کیا کارنامے انجام دیے۔ مختصراً جاہلی ادب میں انشا کے نمونوں کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ عہد نبوی میں خطبات و تقاریر نبوی کی ادبی حیثیت کو اجاگر کیا گیا ہے پھر خلفاء اربعہ بالخصوص خلیفہ چہارم حضرت علی کے خطبات جو نہج البلاغہ میں محفوظ ہیں، کا مختصر تجزیہ ہے۔ اموی عہد میں حجاج بن یوسف ثقفی، طارق بن زیاد کے خطبات اور اس دور کے نمایندہ کاتب عبدالحمید کے رسایل و مقالات کا ایک سرسری مگر تنقیدی مطالعہ کیا گیا ہے۔ عہد عباسی میں جاحظ، بدیع الزماں ہمدانی وغیرہ کی ادبی کاوشوں کا جایزہ لیا گیا ہے۔ اور اس انشائی ادب کے کارواں کی عرب تاریخ کو ابن العمید کے کارناموں پر ختم کیا گیا ہے

چونکہ عرب انشا ہی فارسی انشا کے وجود و ارتقا کی بنیاد تھی اس لیے فارسی ادبیات پر عرب انشا کے اثرات کا جایزہ لیا گیا ہے۔ صفاریوں کے عہد میں فارسی ادبیات کے نشو و نما پانے اور اس عہد کے مشہور انشا پرداز محمد بن وصیف کی ادبی کاوشوں کا ذکر ہے۔ بعد میں فارسی ادبیات کے مختلف مدارج ارتقا کا مفصل اور تنقیدی مطالعہ کیا گیا ہے۔ سامانی عہد اور ان کے جانشین غزنویوں کے فارسی ادبیات خاص کر انسانی ترقی و تہذیب میں کارناموں کا ایک جایزہ لینے کے بعد حکومت کے ڈھانچے میں دیوان انشا اور اس کے ساتھ ساتھ دیوان رسالت کی تاریخ آغاز و ارتقا پر ایک نظر ڈالی گئی ہے کیونکہ مدت تک انشا پردازی کے

نمونے صرف ان "سرکاری کاتبوں" کی تخلیقات (دستاویزات، خطوط و رسایل وغیرہ) ہی ہیں، جو سرکاری سرپرستی میں قلم کے جوہر دکھاتے تھے۔ اس ضمن میں بلعمی، ابوالفضل بیہقی، دعاف، خطاملک جوینی وغیرہ کے ادبی کارناموں کا ذکر کیا گیا ہے۔

اس باب کا دوسرا حصہ جو خاصا وسیع ہے سلطنت دہلی میں انشائی ادب کے ارتقا سے متعلق ہے۔ سلطنت کے قیام سے لیکر امیر خسرو کے عہد تک فارسی ادبیات پر عمومی نظر ڈالی گئی ہے اور انشا کے کارناموں کا بغور مطالعہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ حسن نظامی، عوفی، منہاج سراج، جیسے مشہور مورخین کے ادبی کارناموں کے علاوہ سرکاری انتظامیہ سے متعلق دبیران کرام مثلاً امیر فخرالدین دبیر، تاج الدین دبیر، قوام الدین علاقہ دبیر، خواجہ علاء دبیر، اعزالدین دبیر ممالک وغیرہ کا جایزہ بھی ہے۔ بعد میں سلطنت عہد کے بعض نمایندہ کاتبوں امیر خسرو، عین الملک عبداللہ بن ماہرو اور محمود گاواں کی انشا کی خصوصیات سے بالتفصیل بحث کی گئی ہے۔ اور آخر میں ہندوستانی تاریخ میں انشا و ادب پر ایک تکملہ بھی شامل ہے۔

باب دوم ۱۰۹ - ۵۵

دوسرا باب اعجاز خسروی کے فنی، موضوعاتی اور تکنیکی تجزیے پر ہے اور ہر رسالے کے مضامین اور ان کی ترتیب کے بارے میں مصنف کتاب کے طریقہ کار سے بحث کی گئی ہے۔ ابتدا میں اعجاز خسروی کی تاریخ تصنیف و تدوین پر ایک تنقیدی مطالعہ شامل ہے۔ اس کے بعد ہر رسالے کے ڈھانچے اور مضامین کا الگ الگ جایزہ لیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں ان رسایل، مکتوبات و رقعات کے زبان و بیان اور تکنیک سے بحث کی گئی ہے۔ اور آخر میں بنیادی خطوط اور تصحیحی مخطوطات کے بارے میں توضیحی اشارے دیے گیے ہیں۔

باب سوم ۱۸۹ - ۱۰۹

تیسرا باب " اعجاز خسروی میں تاریخی مواد" پر مشتمل ہے جو دراصل

ان مکتوبات، خطبات، توقیعات رقعات اور فتحناموں وغیرہ کا انگریزی میں خلاصہ ہے جو امیر خسرو نے وقتاً فوقتاً تحریر کیے تھے۔ بطور پیش لفظ ان تخلیقات کی نوعیت و ماہیت پر بحث ہے پھر مواد موضوع کے اعتبار سے ان مکتوبات و رسایل کا مختلف عناوین کے تحت مطالعہ کیا گیا ہے جو حسب ذیل ہیں:

(۱) سیاسی دستاویزات	:	۵ عدد
(۲) اقتصادی دستاویزات	:	۴ عدد
(۳) انتظامی "	:	۵ عدد
(۴) عدلیاتی "	:	۵ عدد
(۵) تہذیبی "	:	۸ عدد
(۶) متفرقات "	:	کے ذیل میں بہت سے رقعات وغیرہ کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

اس تجزیہ کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ اس کتاب سے معاصر تاریخی معلومات کس حد تک حاصل ہو سکتی ہیں اور آخر میں اس پر بحث کی گئی ہے کہ ان معلومات کا پایۂ اعتبار کیا ہے؟

آخر میں اعلام، اماکن اور کتب وغیرہ پر توضیحی تعلیقات ہیں جن کی تعداد بہت کافی ہے اور جو ص۱۸۹ سے ص۲۷۹ تک وسیع ہے۔ خاتمۂ مطالعہ پر ایک کتب نما بھی شامل ہے۔ جس میں ان ماخذ و کتب کی نشان دہی کی گئی ہے جن سے اس مقالے میں مدد لی گئی اور جو سلطنت دہلی کے اس پورے عہد پر تاریخی روشنی ڈالتے ہیں۔

یہ مقالہ سنہ۱۹۷۰ء کے اواخر میں جمع کیا گیا اور مارچ سنہ۱۹۷۵ء میں ڈگری عطا کی گئی۔